آزادیٔ پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کے مراحل طے کرتی ہوئی داستان
قصہ نصف صدی کا
محی الدین نواب

محی الدّین نواب کے جادُو قلم سے...... آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی داستان

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

قصّہ نصف صدی کا

محی الدّین نواب

علی میاں پبلی کیشنز

20۔عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

فون:7247414

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (محی الدین نواب) اور پبلشرز (علی میاں پبلی کیشنز) محفوظ ہیں۔ ادارہ علی میاں پبلی کیشنز نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلیے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کیلیے ہم بے حد ممنون ہیں۔

پیش لفظ

پاکستان ......اقوام عالم میں مسلمانان عالم کے لیے وجہٗ افتخار۔دنیا کی دو نظریاتی مملکتوں میں ایک اسلامی نظریاتی مملکت جو برصغیر کے مسلمانوں کی بے مثال جدوجہد اور عظیم جانی و مالی قربانیوں کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوئی۔آج جب کہ پاکستان کو وجود میں آئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے،ہم گزرے وقت پر نظر ڈالیں تو جہاں ہمارا دامن بہت ساری مسرتوں،شادمانیوں اور کامیابیوں سے معمور نظر آتا ہے وہیں چند عاقبت نااندیش حکمرانوں،سیاست دانوں اور دیگر عمالِ حکومت کی جاہ پرستی کے لیے کی گئی حماقتوں کے باعث بے شمار مایوسیاں اور ناکامیاں بھی ہمیں اپنے ماضی سے سبق آشنا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔آزادیِ پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی یہ داستان انہی شب و روز کی کتھا ہے جو ہمارے لیے ماضی کے آئینے اور مستقبل کے لیے مشعلِ راہ کا کام انجام دیں گے۔ایک ہمہ صفت پاکستانی کی داستان جسے کانگریسیوں نے پاکستانی بنایا اور پاکستانی بن کر اس نے ان چون سالوں میں جو دیکھا اسے اگلی نسل کے لیے بیان کر دیا۔

ادارہ کتاب گھر http://www.kitaabghar.com جنوری ۲۰۰۲ء میں قائم کیا گیا تھا،اور اسکا واحد مقصد نئی نسل کو کتابیں پڑھنے کی طرف راغب کرنا ہے۔آج جب کتابیں پڑھنا بالعموم اور خرید کر پڑھنا بالخصوص کم ہو گیا ہے،ایسے میں یہ بہت ضروری تھا کہ ایسے کچھ اقدام کیے جائیں تاکہ کتابوں سے،جو کہ انسان کی بہترین دوست ہیں،رابطہ قائم رہے،تعلق استوار رہے۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ آج تقریباً ہر گھر میں موجود ہے۔نوجوان نسل اپنے فرصت کے لمحات میں اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔یہ استعمال تعلیم کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور محض تفریح کے لیے بھی۔ہر دو صورتوں میں بہرحال یہ معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔ادارہ کتاب گھر نے ان ہی دو چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے مُفت کتابوں (e-books) کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

کتاب گھر پر اپنے قارئین کی خدمت میں محی الدین نواب صاحب کا یہ پہلا ناول پیش کیا جا رہا ہے۔انشاءاللہ نواب صاحب کے مزید ناول بھی جلد پیش کیے جائیں گے۔

آپ لوگ اپنی آراء سے نوازتے رہیں تاکہ ہم بہتر انداز میں اُردو زبان،اور اُردو بولنے والوں کی خدمت کر سکیں۔

ادارہ کتاب گھر

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ جب ایسا ہوتا ہے، تب یہ بات ہمارے تجربات میں شامل ہو جاتی ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتا آیا ہے۔ ہم جس بات کو نہیں مانتے، حالات ایک دن اسے منوا لیتے ہیں۔

میں کانگریس کے جلوس میں ہندوؤں کے ساتھ تھا اور جے ہند کے نعرے لگا رہا تھا۔ وہ چودہ اگست انیس سو سینتالیس کا دن تھا۔ اس روز پاکستان وجود میں آیا تھا لیکن میں جے ہند کے نعرے لگا رہا تھا۔ میرا ضمیر، میرا دل، میرا دماغ کہتا تھا، جس گھر میں رہو، اس گھر کی سلامتی چاہو اس لیے میں ہندوستان کی جے چاہتا تھا اور جے ہند کہہ دینے سے میرے مسلمان ہونے پر کوئی حرف نہیں آ سکتا تھا۔

دوسرے دن پندرہ اگست کو ہندوستان آزاد ہونے والا تھا۔ ہمارے شہر میں ہندوؤں کی اکثریت کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سیاسی سوجھ بوجھ کے پیشِ نظر ہندوستان کی آزادی سے ایک دن قبل پاکستان کو وجود میں لایا گیا؟ پہلے پاکستان کیوں بن گیا؟ ہندو لیڈروں نے جنتا کو یہ باتیں سمجھانے کی کوششیں کی لیکن غصہ پھر غصہ ہوتا ہے۔ بھڑکتا ہے تو آگ کی طرح پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی آگ پہلے ہی بھڑکی ہوئی تھی۔ اس جلوس میں اور بھڑک گئی، جس میں، میں شامل تھا۔ ایک شخص نے ایک اچانک ہی اپنے پاجامے کے کمر بند سے ایک چھرا نکالا پھر میرے قریب کھڑے ہوئے ایک مسلمان کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہوگا کیونکہ جتنے مسلمان اس جلوس میں شریک تھے، وہ سب کے سب مسلم لیگی نہیں، کانگریسی تھے۔ ہم میں سے کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک کانگریسی دوسرے کانگریسی کو چھرا گھونپ دے گا۔ میرے محلے کے مسلمانوں نے چھ ماہ پہلے مجھے سمجھا دیا تھا۔ ''تم مسلمان ہو، تمہیں مسلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے''۔

میں نے جواب دیا تھا۔ ''میں پیدائشی مسلمان ہوں اور پیدائشی ہندوستانی بھی ہوں۔ میرا مذہب اسلام ہے۔ مگر میرا وطن ہندوستان ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے علامہ اقبال نے بھی ہندوستان پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ایک بزرگ نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''کوئی مجھے یقین دلائے کہ ہمارا یہ علاقہ پاکستان بن جائے گا تو میں نعرہ لگاؤں گا۔ لے کے رہیں گے پاکستان، میری وفا اور میری جان پاکستان کے لیے ہوگی''۔

ان بزرگ نے کہا۔ ''میاں! ابھی جوان ہو۔ جوانی میں جذبات آگے چلتے ہیں اور عقل پیچھے رہ جاتی ہے۔ ہندوستان کا کوئی بھی علاقہ پاکستان بنے۔ اسے بنانے کے لیے ہم میں سے ایک ایک مسلمان کی حمایت اور ووٹ کی ضرورت ہے''۔

میں نے پوچھا۔ ''بڑے میاں! پاکستان بننے کے بعد ہندوستان میں ہمارا انجام کیا ہوگا؟''

''تم ہندوستان میں کیوں رہو گے؟ پاکستان اس لیے وجود میں آئے گا کہ ہم مسلمان وہاں جا کر آزادی کے ساتھ محفوظ زندگی گزاریں''۔

''پاکستان ایک چھوٹی سی کشتی کے مانند ہے۔اس پر کتنے مسافر سوار ہو سکتے ہیں؟ میں اس کشتی کو ڈبونا نہیں چاہتا۔اسے رواں دواں دیکھنا چاہتا ہوں۔اس کے لیے لازمی ہے کہ میں ہندوستان میں رہوں اور یہاں رہنے کے لیے ہندوؤں کا اعتماد حاصل کروں''۔

ان دنوں میری باتیں سمجھنے والے بہت کم لوگ تھے۔اسی لیے...... میری باتوں کی نفی ہو رہی تھی۔جب ایک مسلمان کے پیٹ میں چھرا گھونپا گیا تو میں فوراً چند لوگوں کے پیچھے چلا گیا۔اس بدنصیب کے بعد میری باری آسکتی تھی۔وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی۔میں دوڑتا ہوا ایک ہندو لیڈر کے پاس آ گیا۔ہانپتے ہوئے بولا۔''شرما جی،غضب ہو گیا۔ہمارے ایک کانگریسی ہندو نے ایک کانگریسی مسلمان کو مار ڈالا ہے''۔

رندھیر شرما نے کہا۔''کیا بکتے ہو۔آج پاکستان بن چکا ہے۔کل ہمارا دیش آزاد ہونے والا ہے۔اب ہندو مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں رہا۔تم یہ کہو گے کہ ایک ہندو نے مسلمان کو قتل کیا ہے تو پھر فسادات کی آگ بھڑک جائے گی''۔

آگ تو بھڑک چکی تھی۔دو غنڈے چھرا اور نیزہ لئے میرا کام تمام کرنے آ گئے۔کچھ کانگریسی میرے چاروں طرف ڈھال بن گئے۔شرما جی نے ان غنڈوں کو ڈانٹ کر کہا۔''اندھے ہو گئے ہو؟ ہمارے بھائی علی امام کو نہیں پہچانتے ہو؟ یہ پرانے کانگریسی ہیں''۔

وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔وہاں سے پلٹ کر اس بھیڑ میں دوسرے مسلمانوں کی تلاش میں چلے گئے۔اس روز میری جان بچ گئی۔میرے کچھ ہندو دوست مجھے میرے محلے کے قریب پہنچا کر چلے گئے۔شام کا دھندلکا،اندھیرے میں تبدیل ہو رہا تھا۔مسلمانوں کی ٹولیاں اپنے علاقوں میں باری باری جاگ کر پہرا دیتی تھیں۔میں اپنے محلے میں پہنچا تو ایک پہرا دینے والے جوان نے کہا۔''آ گیا ہندوؤں کا جاسوس......''

دوسرے نے کہا۔''جاسوس نہیں،تھالی کا بینگن کہو۔کبھی لڑھک کر اُدھر جاتا ہے اور کانگریسی بھائی کہلاتا ہے۔کبھی لڑھک کر ادھر آتا ہے اور اپنے مسلمان ہونے کا فائدہ اٹھاتا ہے''۔

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے،ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں،لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے،آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے،کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

میں سر جھکائے چپ چاپ ان کے سامنے سے گزر گیا۔ ان دنوں ہندوستان کے مسلمان، پاکستان کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔ اگر میں جواباً کچھ کہتا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ مار ڈالتے یا ہاتھ یا پاؤں توڑ دیتے۔ میں نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ابا جان نے دروازہ کھولا۔ پھر مجھے دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر کر چلے گئے۔ اماں بی، بھائی جان، بھابی جان، میری بہنیں اور دوسرے رشتے دار سامانِ سفر باندھ رہے تھے۔ دوسرے دن ایک اسپیشل ٹرین مسلمانوں کو پاکستان لے جانے والی تھی۔ ہمارا گھر اور وہ محلہ مسلمانوں سے خالی ہونے والا تھا۔

اماں بی مجھے دیکھتے ہی رونے لگیں۔ بھائی جان نے کہا۔ ''آپ کیوں روتی ہو؟ کیا یہ آپ کے آنسوؤں سے پگھل جائے گا؟''

اماں بی نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹے! بس ایک رات رہ گئی ہے۔ کل سب ہی چلے جائیں گے۔ تمہاری پھوپی، خالائیں، ماموں اور چچا کا پورا کنبہ جا رہا ہے۔ تم بالکل تنہا رہ جاؤ گے۔ کہاں کھاؤ گے، کہاں رہو گے؟ یہ ریلوے کا کوارٹر ہے۔ تمہیں یہ جگہ چھوڑنی ہوگی۔ میرے ساتھ چلو بیٹے! میں جانے کو تو جا رہی ہوں مگر تمہاری فکر میں کل کی جیتی، آج مر جاؤں گی''۔

میں نے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا سایہ ہمارے سروں پر رہے گا۔ آپ میرے دو بھائیوں اور تین بہنوں کی بھی ماں ہیں۔ آپ کو ان کے لیے بھی زندہ رہنا ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ یہ قافلے جو پاکستان جا رہے ہیں، ان کی دھول بن کر مجھے پیچھے رہ جانے دیں''۔

میں آگے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر پچھلے کئی ماہ سے یہی بحث چل رہی تھی۔ میں انہیں پاکستان جانے سے روکتا تھا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اس ضد میں ابا جان اور بھائی جان مجھ سے پوری طرح ناراض ہو گئے تھے۔ ابا جان نے غصے سے کہا۔ ''اس مردود کو یہیں مرنے دو۔ کوئی اس کی قبر کھودنے والا بھی نہیں ہوگا۔ ہندو اس کی چتا جلائیں گے''۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرے دل پر بوجھ تھا، میں اپنے ارادے کی پختگی سے اپنوں کو رُلا رہا تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کی بات ہوتی تو بچھڑنے والے اس قدر نہ روتے۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جا رہے تھے۔ جانے کے بعد نہ جانے کیسے سیاسی حالات ہوتے۔ کبھی دوسرے کی صورت دیکھنے کو ملتی یا نہیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ سب ہی کا مستقبل دھندلا سا گیا تھا۔

میری بہن رات کا کھانا لے کر آئی تو اس کی سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ مجھ سے بچھڑنے کا خیال اسے رُلا رہا ہے۔ وہ رائٹنگ ٹیبل پر کھانا رکھ کر جانے لگی۔ میں نے کہا۔ ''صابرہ! ہم ہمیشہ کے لیے جدا نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے تم لوگوں کو میری اور میرے شہر کی ضرورت پیش آئے اور تم سب واپس آ جاؤ اور ہو سکتا ہے مجھے تم لوگوں کی ضرورت پیش آئے اور میں چلا آؤں''۔

''آپ اس لیے یہاں رہیں گے کہ ہمارے جانے کا فیصلہ غلط ہے؟''

''تمہیں دیکھتا ہوں تو فیصلہ درست لگتا ہے۔ مسلمان لڑکیاں اب یہاں رشتوں کے لیے بیٹھی رہ جائیں گی۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگی، وہاں اچھے سے اچھے لڑکے کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اب مشکل سے جیسا بھی اچھا برا لڑکا ملے گا، اسے اپنی بہن یا بیٹی کے لیے

قبول کرنا پڑے گا''۔

وہ میری باتیں سن کر چلی گئی۔ اچھا ہوا چلی گئی۔ میں اس سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ جوان ہو چکی ہے۔ اسے کوئی مسلمان لڑکا چھیڑے گا تو غیرت سے میں اسے مار ڈالوں گا اور ہندو لڑکے چھیڑیں گے تو کس کس کو ماروں گا؟ خود ہی شرم سے مرجاؤں گا۔ ایسی جوان لڑکیوں کو اپنے والدین اور سرپرستوں کے ساتھ پاکستان ضرور جانا چاہئے۔

میں روٹی کھا رہا تھا۔ تب خوشبو کا جھونکا آیا۔ میں دروازے کی طرف دیکھے بغیر کہہ سکتا تھا کہ میری شبو آئی ہے۔ وہ میرے ماموں کی بیٹی تھی، میری منگیتر تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ اب اسے کیسے سمجھاؤں؟ سمجھاتے سمجھاتے سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے اور وہ اپنے لفظوں پر اڑی ہوئی تھی۔ ''میرے ساتھ چلو یا مجھے اپنا کر یہیں رکھ لو''۔

وہ تیسری کوئی بات نہیں جانتی تھی۔ اس وقت وہ میرے پیچھے آ کر کھڑی ہوگئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ''تمہارا جھکا ہوا سر کہہ رہا ہے کہ تم آہٹ کو پہچان لیتے ہو۔ مجھے اس قدر چاہتے ہو مگر شریکِ حیات نہیں بنا سکتے''۔

''یہ بات نہیں ہے، میں یہاں اپنے ساتھ تمہیں مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا''۔

''اور میں یہاں تمہارے ساتھ مصیبت میں رہوں گی، یہ میرا فیصلہ ہے''۔

''شریف زادیاں اپنے مستقبل کے فیصلے خود نہیں کرتیں۔ ان کے بزرگ کرتے ہیں''۔

''بزرگ زندگی سنوارنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں موت کا فیصلہ کر کے آئی ہوں''۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا دماغ چل گیا ہے؟''

''ہاں دماغ چل گیا ہے۔ میں نے امی اور ابو سے پوچھا تھا، کیا ہم چند روز بعد پاکستان نہیں جا سکتے؟ وہ کہتے ہیں کل اسپیشل ٹرین جا رہی ہے۔ پوری ٹرین میں مسلمان ہی مسلمان ہوں گے۔ ہم خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں گے''۔

''وہ درست کہتے ہیں''۔

''لیکن میں سب کا سفر ملتوی کرا دوں گی''۔

''کیا کہہ رہی ہوں؟''

''جو کہہ رہی ہوں، کر کے دکھاؤں گی۔ صرف میرے ہی نہیں، تمہارے والدین کو بھی میرے کفن دفن کے لیے رکنا پڑے گا''۔

میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے حیرانی اور پریشانی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم پاگل ہو گئی ہو''۔

''ظاہر ہے پاگل ہی ایسی حرکتیں کرتے ہیں''۔

میں خاموشی سے اسے دیکھتا اور سوچتا رہ گیا۔ وہ بچپن سے دیکھی بھالی تھی۔ میں اس کی ضدی طبیعت اور ارادوں کی پختگی کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ جو کہتی تھی، وہ کر گزرتی تھی۔ جب وہ بارہ برس کی تھی تو ممانی جان نے اسے سر پر دوپٹا رکھنے کو کہا۔ اس نے جواب دیا۔ ''دوپٹا پھسل پھسل

جاتا ہے، میں سر پر نہیں رکھوں گی''۔

ممانی جان نے کہا۔''عادت ڈالو گی تو سر پر رہا کرے گا''۔

''مجھے نہیں ڈالنی ہے عادت۔ میں دوپٹا نہیں اوڑھوں گی''۔

''کیسے نہیں اوڑھے گی۔ چل اسے پر سر رکھ''۔

ممانی نے اس کی پٹائی کی۔ اس نے مار کھا کر بھی دوپٹے کو پھینک دیا۔ ممانی اسے کھینچتی ہوئی آنگن میں لائیں پھر بولیں۔''یہاں کھڑی رہ۔ جب تک دوپٹا نہیں لے گی، تجھے یہاں سے ہلنے نہیں دوں گی''۔

وہ اسے دھوپ میں چھوڑ کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ ماہ جون کا جلتا ہوا سورج سر پر تھا۔ وہ دوپٹے کا سایہ کر سکتی تھی۔ مگر ضد ہو گئی تھی کہ اسے ہاتھ نہیں لگائے گی۔ ایک بجے آنگن کا پختہ فرش چولہے پر رکھے توے کی طرح جل رہا تھا۔ مگر وہ اللہ کی بندی اسی طرح کھڑی رہی۔ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہاتی رہی۔ ممانی نے سوچا کہ اس کے ابو دیکھیں گے تو اسے کمرے میں لے جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ پڑوسن کے گھر جا کر بیٹھ گئی تھیں۔ سہ پہر کے بعد تقریباً چار بجے واپس آئیں تو بیٹی کو جلتے سورج کے نیچے دیکھ کر کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ دھوپ اور گرمی ایسی تھی کہ کسی جانور کا گوشت آنگن کے فرش پر رکھا جاتا تو وہ جل بھن کر رہ جاتا۔ ممانی جان دوڑتی ہوئی آئیں۔ اپنا دوپٹا اس پر ڈال کر سایہ کیا پھر اسے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے آئیں۔ اس کے بعد پھر کبھی انہوں نے اسے دوپٹا سر پر رکھنے کے لیے نہیں کہا۔

دوسرے دن وہ ہمارے گھر آئی۔ میں نے پوچھا۔''تمہارا دوپٹا کیا ہوا؟''

''مجھے بوجھ لگتا ہے''۔

''مجھے تو اچھا لگتا ہے''۔

اس نے بحث نہیں کی۔ چپ رہی۔ پھر جاتے وقت بولی۔''شام کو آؤ گے؟''

میں نے وعدہ کیا۔ پھر جب شام کو گیا تو وہ دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی۔ ہم بڑی خوشی سے ایک دوسرے کی بات مان لیا کرتے تھے۔ کچی عمر میں یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایک دوسرے کی پسند کو اپنی پسند بنانے کا نام محبت ہے۔ ماموں ممانی نے اس کی کتابوں اور کاپیوں میں میرا نام پڑھ کر ہماری منگنی کر دی تھی۔ اب یہ وقت آیا تھا کہ میں اس کی خاطر بھی پاکستان نہیں جا رہا تھا۔ اس نے شکایت کی۔''کیا تمہاری نظروں میں میری اتنی سی اہمیت بھی نہیں ہے؟ امی اور ابو مجھے یہاں سے لے جا رہے ہیں اور تمہارے دل میں کوئی بے چینی نہیں ہے؟''

''میں اپنے دل کا حال کیا بتاؤں؟ بچپن سے تمہیں چاہتا آیا ہوں، میں کیا بتاؤں کہ کتنا مجبور ہوں؟''

''کیا تم جوان اور صحت مند نہیں ہو؟ کیا محنت مزدوری کر کے مجھے دو وقت کی روٹیاں کھلا نہیں سکو گے؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ جس طرح یہاں سے مسلمان جا رہے ہیں، اسی طرح وہاں سے ہندو شرنارتھی آنے والے ہیں۔ کوئی یہ سمجھنا نہیں چاہے گا کہ مسلمان یہاں سے کس طرح تباہ و برباد ہو کر اپنے گھر اپنی جائیداد چھوڑ کر گئے ہیں۔ وہاں سے آنے والے ہندو اپنی تباہی اور بربادی

کا ڈھنڈورا سنائیں گے تو یہاں کے ہندوؤں کے جذبات بھڑکیں گے۔ آنے والے اجنبیوں کے درمیان تمہیں اپنے ساتھ رکھنا، ایک مستقل مسئلہ ہوگا''۔

''میں کچھ نہیں جانتی، رہوں گی تو تمہارے ساتھ۔ ورنہ کسی کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ کسی ملک میں نہیں رہوں گی۔ اس دنیا سے چلی جاؤں گی''۔

میں جانتا تھا، اس کی یہ دھمکی قابلِ عمل ہے۔ وہ جان پر کھیل جائے گی۔ میں نے کہا۔ ''تم گھر جاؤ، میں ماموں سے ملنے ابھی آرہا ہوں''۔

''میں امی ابو کے ساتھ آئی ہوں''۔

میں نے قریب ہو کر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام لیا، پھر کہا۔ ''میں ماموں جان سے ایک آخری بات کرنے جارہا ہوں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری دھمکی سے مجبور ہوگیا ہوں۔ تمہاری محبت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے۔ پھر بھی اس دھمکی نے تمہارے پیار کی گہرائی کا ثبوت دیا ہے۔ کل ہندوستان آزاد ہورہا ہے۔ آئندہ کے اجنبی ماحول میں تمہارے جیسی جان پر کھیل جانے والی لڑکی ہی میری شریکِ حیات بن کر رہ سکتی ہے''۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر امی کے کمرے میں آیا۔ وہاں ماموں ممانی کے علاوہ کئی رشتے دار بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری صبح روانگی تھی۔ اسلیے وہ اپنی اپنی سفر کی تیاریوں کا ذکر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب چپ ہوگئے۔ میں جو کہنے آیا تھا، اسے تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا۔ خاندان کے تمام چھوٹے بڑے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتے تھے تو میں خود کو مجرم سمجھنے لگتا تھا۔ اس وقت میں نے یہی بات ان سے کہی۔ ''آپ لوگ مجھے ایسے دیکھتے ہیں جیسے میں مجرم ہوں۔ کوئی بہت بڑا جرم کر رہا ہوں''۔

میری خالہ نے کہا۔ ''کیا ماں باپ کو رُلانا اور بڑھاپے میں ان کا ساتھ چھوڑ دینا اخلاقی جرم نہیں ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اماں بی اور ابا جان کے ساتھ دو جوان بیٹے جارہے ہیں۔ میرے ایک نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔

ماموں نے پوچھا۔ ''یہ ہمارے ساتھ زیادتی نہیں ہے کہ تمہارے نہ جانے کی وجہ سے ہمیں بیٹی کی منگنی توڑنی ہوگی؟''

''آپ یہ ہونے والا رشتہ کیوں توڑیں گے؟''

ممانی نے کہا۔ ''کیا نادان بچے ہو؟ نہیں جانتے کہ شبو تم سے منسوب رہے گی، تو ہم تمہارے انتظار میں وہاں اسے بوڑھی نہیں کریں گے۔ پاکستان میں اس کے لیے دوسرا لڑکا دیکھنا ہوگا''۔

''نہیں ممانی جان! ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ تمام بزرگ چاہیں تو ابھی ہماری شادی ہوسکتی ہے''۔

''کیا!'' تمام بزرگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

پھوپی نے ناگواری سے کہا۔ ''کیا شادی گڈے گڑیا کا کھیل ہے؟''

چچانے مجھ سے کہا۔ ”تم آدھے پاگل ہو۔ ایسے وقت میں ساتھ چھوڑ رہے ہو، جب بزرگوں کو جوان اولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل پتا نہیں ہمارے سفر کا آغاز کیسا ہوگا؟ ہندو بلوائی ہماری اسپیشل ٹرین پر حملے کر سکتے ہیں۔ ہم فکر، پریشانی اور اندیشوں میں گھرے ہوئے ہیں اور صاحب زادے اپنی شادی کی خوشیاں منانا چاہتے ہیں“۔

”میں آپ لوگوں سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں، ابھی ہمارا نکاح پڑھایا جاسکتا ہے یا نہیں؟“

”نہیں......نہیں......نہیں......“ جتنے بزرگ تھے سب، نہیں نہیں کی گردان کر رہے تھے۔ صرف خالہ اور ممانی چپ تھیں۔ وہ میری اور شبو کی چاہت کو خوب سمجھتی تھیں۔ ماموں جان پس وپیش میں تھے۔ کوئی جواب نہیں دے پا رہے تھے۔

اماں بی نے دبی زبان سے کہا۔ ”میں تو برسوں سے شبو کو بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی ہوں“۔

بھائی جان نے کہا۔ ”آپ کے خواب دیکھنے سے وہ بہو بن کر آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ آپ کے لاڈلے کے ساتھ یہیں رہ جائے گی“۔

ابا جان نے کہا۔ ”یہ سرپھرا، آوارہ لڑکا، یہ کیا جانے شادی اور ازدواجی ذمے داریاں کیا ہوتی ہیں؟ یہ سمجھتا ہے، ہم کسی کی جوان بیٹی کو اس کے قدموں میں پھینک کر چلے جائیں گے؟ ہم اتنے ظالم نہیں ہیں۔ شادی اتنی جلدی نہیں ہوگی۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے“۔

ماموں جان نے میرے والد سے کہا۔ ”بھائی جان! آپ غصہ نہ کریں۔ علی امام آخر آپ کا بیٹا ہے۔ اسے محبت سے سمجھائیں، یہ پاکستان چل کر شبو سے شادی کرلے۔ اس کے بعد یہاں واپس آنا چاہے تو ہم انہیں......نہیں روکیں گے“۔

میں نے کہا۔ ”ماموں جان! میں اپنی شریکِ حیات کا بوجھ یہاں اٹھا سکتا ہوں تو پھر مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے“۔

چچانے کہا۔ ”یہ لڑکا اول درجے کا ضدی اور گستاخ ہے“۔

پھوپی نے کہا۔ ”اگر شادی ہوئی تو ہم شریک نہیں ہوں گے“۔

یکے بعد دیگرے سب انکار کرنے لگے۔ میں سر جھکا کر وہاں سے نکل آیا اور اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولنا چاہا، وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آواز دی۔ ”شبو! دروازہ کھولو“۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا وہ راضی ہوگئے؟“

”نہیں، سب انکار کر رہے ہیں“۔

”تو پھر یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ میرے اور اپنے والدین کو بلاؤ، میں آخری بار پوچھوں گی“۔

”تم دروازہ تو کھولو“۔

”دروازہ نکاح کے بعد کھلے گا یا پھر اسے توڑ کر میری لاش نکالنی ہوگی“۔

میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو شبو! کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔ مجھ پر بھروسا کرنا۔ نہیں تو میں بھی جان

دے دوں گا''۔

پھر میں نے اماں بی اور ماموں جان کو پکارتے ہوئے کہا۔''یہاں آ کر دیکھیں، شبو نے دروازہ بند کرلیا ہے، خودکشی کرنا چاہتی ہے''۔

دروازہ پیٹنے کی آواز سن کر پہلے ہی کچھ رشتے دار آ رہے تھے۔ میری بات سن کر سب ہی چلے آئے۔ ماموں جان آتے ہی دروازے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ ممانی جان نے کہا۔''شبو! یہ کیا بے حیائی ہے، دروازہ کھولو''۔

اندر سے اس کی آواز آئی۔''بزرگ دانائی کا ثبوت دیں تو جوان بچے کبھی بے حیائی پر مجبور نہ ہوں''۔

چچا جان نے گرج کر کہا۔''دروازہ کھولو ورنہ ہم توڑ دیں گے''۔

وہ بھی اندر سے کڑک کر بولی۔''میرے ایک ہاتھ میں پانی ہے اور دوسری مٹھی میں زہر کی پڑیا ہے۔ میں دروازہ ٹوٹنے سے پہلے ہی اسے پھانک لوں گی''۔

پھوپی نے کہا۔''ارے، یہ کیا زہر کھائے گی، ناٹک دکھا رہی ہے۔ دروازہ توڑ دو اور چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے یہاں سے لے جاؤ''۔

ممانی جان نے پھوپی کے سامنے تن کر کہا۔''دروازہ توڑنے کے بعد میری بیٹی زندہ نہیں ملے گی تو کیا تم اسے زندہ کر دو گی؟''

''اے میرے منہ نہ لگو۔ میں کیا جانوں وہ زندہ رہے گی یا مر جائے گی۔ ہمارے خاندان کی لڑکیاں ایسی بے حیا نہیں ہوتیں''۔

''ہاں، ہاں معلوم ہے۔ تمہارے خاندان کی لڑکیاں اعلیٰ درجے کی بے حیائی دکھاتی ہیں۔ تمہاری بہن گھر سے بھاگی تھی، آج تک واپس نہیں آئی''۔

اس بات پر ابا جان اور چچا جان کو آگ لگ گئی کیونکہ ان کے خاندان پر کیچڑ اچھالی جا رہی تھی۔ وہ ممانی جان کو باتیں سنانے لگے۔

ممانی جان نے کہا۔''اپنی بہن کی زبان کو لگام دیں۔ پہلے اس نے ہمارے خاندان پر کیچڑ اچھالنے کی حماقت تھی۔ میری بیٹی آپ ہی کے گھر کے ایک کمرے میں بند ہے اور آپ ہی کے بیٹے کے ساتھ بدنام ہو رہی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ اس کو بے حیا کہا جا رہا ہے۔ کوئی مجھے اینٹ مارے گا تو میں پتھر تو ماروں گی، خاموش نہیں رہوں گی''۔

بھائی کی شادی پھوپی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ وہ اپنی ساس کے خلاف باتیں نہیں سن سکتے تھے۔ انہوں نے ممانی سے کہا۔

''آپ خواہ مخواہ چیخ چیخ کر ہمارے گھر کو تماشا نہ بنائیں۔ اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جائیں''۔

میں نے کہا۔''شبو نہیں جائے گی۔ ابھی ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا''۔

میرے خالو اس علاقے کے قاضی تھے۔ انہوں نے کہا۔''جو کام سہولت سے ہو سکتا ہے، اس کے لیے اتنی بات کیوں بڑھائی جا رہی ہے۔ برسوں پہلے ان دونوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ لڑکا لڑکی راضی ہیں۔ لڑکے کے والدین کو سوچنا چاہئے کہ بیٹا یہاں تنہا نہ رہے، اسے ایک

شریکِ حیات دے جائیں۔ لڑکی کے والدین کو سمجھنا چاہیے کہ نئے ملک، نئی جگہ، نئے شہر جوان بیٹی کا بوجھ نہیں لے جانا چاہیے۔ منگنی کی تھی تو شادی بھی کر دینی چاہیے۔ یہی معقول بات ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے فتنہ وفساد کے سوا کچھ نہیں ہے"۔

جو معقول بات سمجھنا نہیں چاہتے تھے وہاں سے جانے لگے۔ ابا جان بھی جانا چاہتے تھے، اماں بی نے کہا۔ "آپ منہ پھیر کر بات نہ بڑھائیں، نکاح کی اجازت دیں"۔

ابا جان نے سوالیہ نظروں سے میرے بھائی جان کو دیکھا۔ وہ بڑے بیٹے اور بہو کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ بہو نے کہا۔ "میں ایسے معاملات میں شریک نہیں ہوں گی جن کی وجہ سے میرے والدین کی توہین کی گئی ہو۔ اے جی! یہاں سے چلیں"۔

بھائی جان اپنی بیوی کے پیچھے جانا چاہتے تھے۔ اماں بی نے ڈانٹ کر کہا۔ "ارے او جورو کے غلام! یہاں کھڑا رہ۔ تجھے شرم نہیں آتی بیوی کی خاطر بھائی کا نکاح چھوڑ کر جا رہا ہے"۔

بھائی جان، اماں جی کی ڈانٹ میں آنے والے نہیں تھے لیکن انکے سامنے اس لیے سر جھکا کر کھڑے رہے کہ آئندہ چند برسوں میں ابا جان ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہونے والے تھے۔ انہیں پراویڈنٹ فنڈ کی اچھی خاصی رقم ملنے والی تھی۔ وہ والدین کے فرمانبردار بن کر ہی وہ رقم حاصل کر سکتے تھے۔ اماں بی نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ "شبو! دروازہ کھول، اپنے گھر جا۔ ہم بارات لے کر ابھی آئیں گے"۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا، دوسری مٹھی بندھی ہوئی تھی۔ اماں بی نے گلاس چھین کر پھینک دیا۔ پھر شبو کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ "تُو زہر کھائے گی؟ تُو میرے بیٹے کے لیے جان دینے جا رہی تھی؟ اری باؤلی! اتنا پیار تو اس سے میں بھی نہ کر سکی۔ میں نے اسے پیدا کیا اور اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہی ہوں اور تُو اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ بڑی آئی میرے بیٹے سے پیار کرنے والی......"

یہ کہتے ہی وہ شبو کو گلے لگا کر رونے لگیں۔ یہ منظر دیکھنے والے سب ہی آبدیدہ تھے۔ اماں بی نے شبو کے آنسو پونچھے، شبو نے ان کے آنسو پونچھے پھر وہ اپنے والدین کے ساتھ چلی گئی۔ ہمارے ریلوے کوارٹرز کے پیچھے ماموں جان کا اپنا مکان تھا۔ میں چھ افراد کی بارات لے کر اس کے گھر پہنچا۔ نکاح پڑھانے میں دیر نہیں لگی۔ اپنے ہی خالو جان قاضی تھے۔ رخصتی بھی جلدی ہو سکتی تھی لیکن ممانی جان رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔ شبو ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ ایک تو بیٹی کی رخصتی پر یوں بھی رونا آتا ہے لیکن وہاں دوطرفہ رخصتی کے آنسو تھے۔ وہ دس گھنٹے بعد دوسری صبح بیٹی سے رخصت ہونے والی تھیں۔

انہوں نے اماں بی سے کہا۔ "آپا! کل ہم بیٹی سے جدا ہو جائیں گے۔ پھر نہ جانے کبھی ملنے کی کوئی صورت نکلے یا نہیں؟ دلہن کی رخصتی کی رسم رہنے دو۔ یہ صبح تک میرے پاس رہے گی۔ ہم اسپیشل ٹرین میں شبو کو علی اماں کے حوالے کر دیں گے"۔

ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ دلہن لینے آتے ہیں تو لے کر ہی جاتے ہیں لیکن یہاں آپس میں سگی رشتے داری تھی۔ پھر حالات کا تقاضا تھا کہ چند گھنٹوں کے لیے بیٹی کو والدین سے جدا نہ کیا جائے۔ لہٰذا میں شاید پہلا دولہا تھا جو راضی خوشی دلہن کو اس کو میکے چھوڑ آیا تھا۔ اسے چھوڑتے

وقت دل میں انسانی ہمدردی تھی لیکن بستر پر تنہا رات گزارنے آیا تو وہ بری طرح یاد آنے لگی۔ میں اس کے پاس اپنی نیند چھوڑ آیا تھا۔ لوگ بیاہ کر پھول لاتے ہیں۔ میں اپنے بستر پر کانٹے لایا تھا جو اب کروٹ کروٹ چبھ رہے تھے۔

● ● ●

مجھے یاد نہیں ہے وہ رات کیسے کٹی؟ اور کیسے صبح ہوئی؟ نمازیوں نے فجر کی نماز میں مسلمانوں کی سلامتی اور پاکستان کی بقا کے لیے دعائیں مانگیں۔ مندروں میں گھنٹے بج رہے تھے۔ ہندوؤں کے محلوں سے جے ہند اور بندے ماترم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ پندرہ اگست کی صبح تھی۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا تھا۔ ہر گھر کی چھت پر ترنگا لہرا رہا تھا۔ پٹاخے یوں پھوٹ رہے تھے جیسے مسلسل گولیاں چل رہی ہوں۔ مسلمان سہمے ہوئے اپنا سامانِ سفر اٹھائے چھوٹے چھوٹے قافلوں کی صورت میں ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ پٹاخوں کی آوازیں دھمکیاں دے رہی تھیں کہ کہیں بھی ان پر حملہ ہو سکتا ہے۔ ان دنوں ریوالور اور بندوقیں عام نہیں تھیں۔ فرنگی حکمران صرف انہیں ایک بندوق رکھنے کی اجازت دیتے تھے، جو ان کے وفادار غلام ہوتے تھے۔ انہیں خان بہادر یا رحم ویر کا خطاب بھی دیا جاتا تھا۔

فساد برپا کرنے والے تلوار، چھرے اور نیزوں سے حملے کرتے تھے یا دور سے دستی بم پھینکتے تھے۔ جن سے لوگ زخمی تو ہوتے تھے، مرتے نہیں تھے۔ مختصر یہ کہ انتقام لینے یا قتل کرنے کے لئے قریب آ کر چاقو یا تلوار سے حملہ کرنا لازمی تھا۔ ایسے میں ہجرت کرنے والی عورتیں اور بچے سہمے رہتے تھے لیکن مرد حوصلہ مند تھے۔ یہ یقین رکھتے تھے کہ دو چار حملہ آوروں کو مار کر ہی مریں گے۔

آخر وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ اسپیشل ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین کے چاروں طرف ہندوستانی سپاہیوں کا پہرا تھا۔ ان سے پرے بلوا کرنے والے ہندو اور سکھ جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور تلواریں تھیں۔ یہ اندیشہ تھا کہ وہ یہاں حملہ نہ کر سکے تو آگے کہیں ٹرین کو روک کر قتل و غارت گری کا بازار گرم کریں گے۔

اب تو جان رہے یا جائے، پاکستان بن چکا تھا۔ سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف کو ختم ہونے کے لیے تین برس، چار ماہ اور پندرہ دن رہ گئے تھے۔ انسان اس صدی کے وسط میں بدترین فرقہ وارانہ دشمنی کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ یہ پیش گوئی کر رہا تھا کہ اگلی نصف صدی میں انسان، انسان سے محفوظ نہیں رہے گا۔ خواہ ہندوستان میں رہے، پاکستان میں رہے یا دنیا کے کسی ملک میں رہے۔ ہم زندہ انسانوں کی زندہ بستیوں میں اپنی اپنی قبریں کھودنے کی رسم شروع کر چکے تھے۔

ممانی اور ماموں نے شبو کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دیا۔ روتی ہوئی آنکھوں سے اور تڑپتے ہوئے دلوں سے دعائیں دیں۔ جب ٹرین چلنے لگی تو سب نے رونا شروع کر دیا۔ وہاں کوئی سینہ کوٹ رہا تھا، کوئی فریاد کر رہا تھا۔ وہ سب اپنے پیچھے اپنے آباؤ اجداد کی زمین، جائیداد، صدیوں کی روایات، اپنے بچوں کے کٹے ہوئے سر اور اپنے مقتولین کی قبریں چھوڑ کر جا رہے تھے۔ میں نے ہزاروں افراد کو ایک ساتھ روتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔

● ● ●

میں شبو کے ساتھ بوجھل ذہن اور بوجھل قدموں سے واپس آیا۔ اب ہمیں ریلوے کوارٹر میں رہائش کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ ماموں، شبو کے لیے ایک مکان چھوڑ کر گئے تھے۔ ہم وہاں رہائش کے لئے آگئے۔ اس محلے میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ دوسرے محلے کے ہندو سینکڑوں کی تعداد میں آئے تھے۔ جو مسلمان اپنے مکانات چھوڑ کر گئے تھے، وہ سب ان خالی مکانوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ شبو کے مکان کا تالا بھی توڑ دیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ ہمارا مکان ہے، ہم نے خالی نہیں کیا ہے۔ یہاں سے جاؤ''۔

ایک غنڈے نے چھرا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے پاکستان کیا اپنے باپ کے لیے بنایا ہے؟ جاؤ وہاں جا کر گھر بناؤ''۔

غنڈوں کے منہ لگنے سے جان بھی جاتی اور شبو کی عزت بھی، میں نے دبی زبان سے کہا۔ ''میں چلا جاتا ہوں۔ مگر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں مقامی کانگریس پارٹی کا جوائنٹ سیکرٹری ہوں۔ مجھے مسلم لیگی یا پاکستانی نہ کہو''۔

میری باتوں کا اثر نہیں ہوا۔ میں شبو کو لے کر جنرل سیکریٹری کے گھر پہنچا۔ وہاں آزادی کی خوشی میں ایک جلسے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ناچ گانے کا پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب نے جے ہند کا نعرہ لگایا۔ کسی نے مصافحہ کیا، کسی نے گلے لگایا۔ گھر کی عورتوں کے پاس شبو کو پہنچا دیا گیا۔ میری روداد سن کر جنرل سیکرٹری نے چند کارکنوں کو آوازیں دیں، ان سے کہا۔ ''تھانے دار کے پاس جاؤ۔ اس سے کہو چند سپاہی لے کر تمہارے ساتھ جائے اور ابھی امام بھائی کا گھر خالی کرائے۔ ہمارے کانگریسی بھائی کو ہمارے ہی بھائیوں سے تکلیف پہنچے، تو یہ ہمارے لیے شرم کی بات ہے''۔

کچھ کارکن وہاں سے گئے۔ ایک گھنٹے بعد واپس آ کر مجھے چابیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''مکان خالی ہو گیا ہے۔ ہم نے وہاں کے غنڈوں کو وارننگ دی ہے۔ اگر کوئی امام بھائی کو آنکھیں بھی دکھائے گا تو ہم اس کی آنکھیں نکال لیں گے''۔

میں جانا چاہتا تھا۔ جنرل سیکرٹری نے کہا۔ ''دوپہر کا کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گے۔ کیا ہم نئی دلہن کو گھر جا کر کھانا پکانے کا کشٹ دیں گے؟''

کانگریسی نیتا شرما جی کی دھرم پتنی نے کہا۔ ''امام بھائی! دلہن دس رز تک چولہا نہیں جلائے گی، نہ گھر کی جھاڑو دے گی۔ ہم نے شبو کے ہاتھوں میں مہندی لگا دی ہے۔ کام کاج سے مہندی کا رنگ چھوٹ جائے گا''۔

میں نے کہا۔ ''بھاوج! تمہارا حکم سر آنکھوں پر، میں دس روز تک خود کھانا پکاؤں گا اور گھر کی صفائی کیا کروں گا''۔

گھر کے اندر عورتیں ہنسنے لگیں۔ شرما جی نے کہا۔ ''یہ بھی تمہارا گھر ہے۔ تمہارے خاندان کے لوگ جا چکے ہیں۔ مگر تم دونوں اکیلے نہیں ہو۔ شبو ہماری بہو ہے، یہ دن میں ہمارے ہاں رہے گی، تم صبح کا ناشتا، دوپہر کا کھانا یہاں کھاؤ گے۔ پھر رات کے کھانے کے بعد دلہن کو اپنے گھر لے جاؤ گے''۔

بھاوج نے کہا۔ ''انگلیوں پر گن لو۔ دس دنوں تک یہی ہوتا رہے گا۔ ایک نوکر تمہارے ہاں صبح و شام جا کر صفائی کیا کرے گا۔ کپڑے دھوبن کو دے دیا کرنا''۔

وہ مجھے سمجھا رہی تھی کہ نئی دلہن کو کیسے پھول کی طرح رکھنا چاہئے۔ پھر انہوں نے ایک ملازم کو میرے ساتھ لگا دیا۔ میں اسے لے کر شبو کے گھر گیا۔ مسلمانوں کے کئی محلوں میں ہندو شرنارتھیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ جس مکان پر تالا دیکھتے تھے، اسے توڑ کر گھس جاتے تھے۔ پاکستانی علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے ہندوؤں کو مال گاڑیوں کی ویگنوں میں رہنے کی جگہ دی گئی تھی۔ اب وہ ویگنوں سے اپنا سامان لا کر مقبوضہ مکانوں میں رکھ رہے تھے اور وہاں مستقل طور پر آباد ہو رہے تھے۔

میں پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ مکان کی صفائی کرانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر کے سو گیا۔ شبو کو شرما جی کے ہاں گھر جیسا اعتماد اور سکون ملا تو وہ بھی سو گئی۔ میں شام کو وہاں پہنچا۔ رات کے کھانے کے بعد شبو کے ساتھ اپنے مکان میں آنا چاہتا تھا۔ مگر وہاں ناچ گانے کا پروگرام شروع ہو گیا تھا۔ میرے کانگریسی بھائیوں نے زبردستی مجھے روک لیا۔ میں نے کہا۔ ''یارو! میرے لیے بھی آج جشن بھری رات ہے۔ مجھے اپنی دلہن کے ساتھ جشن منانے دو۔ اپنی دوستی اور مہربانیوں سے مجھ پر ظلم نہ کرو''۔

ایک نے کہا۔ ''دلہن تو کل بھی تمہارے ساتھ رہے گی اور ساری عمر رہے گی۔ مگر آزادی کی یہ پہلی رات پھر نہیں آئے گی''۔

میں مجبوراً وہاں رک گیا۔ ادھر شبو کو بھی بے چینی تھی۔ وہ بار بار کھڑکی یا دروازے کے پاس آ کر مجھے دیکھتی تھی۔ سہاگ کی پہلی رات کی طرح دوسری رات بھی جیون ساتھی کے بغیر گزرنے والی تھی۔ ویسے مرد اتنا نہیں سمجھتے، جتنا عورتیں تاڑ لیتی ہیں۔ گھر کی عورتوں نے شبو کی بے قراری کو سمجھ لیا تھا۔ بھاوج نے رات کے ایک بجے مجھے اندر بلایا۔ میں نے ان کے پاس آ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''بات کیا ہو گی؟ دلہن کو کس لیے بیاہ کر لائے ہو؟ چلو، وہ بلا رہی ہے''۔

دوسری عورتیں ہنسنے لگیں۔ میں ان کے ہجوم میں ایک کمرے تک آیا۔ ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ دو چار لڑکیوں نے مجھے دھکا دیا۔ بعض رسم و رواج بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد ایسی رسم بھی ہوتی ہے کہ پیار کے پہلے دروازے کے پار دھکے دے کر پہنچایا جاتا ہے۔ میں کمرے کے اندر پہنچا تو پھولوں بھری سیج پر دلہن گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ میرا پورا وجود پھولوں کی مہک سے بھر گیا۔ میں نے فوراً دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

وہ ہماری زندگی کا خوش گوار اور یادگار موڑ تھا۔ ہم نے مسرت بھرے لمحات میں بچھڑنے والوں کو یاد کیا۔ کچھ اداس ہوئے پھر مسرتوں میں کھو گئے کیونکہ خوشیوں کے لمحات کم ہوا کرتے ہیں۔ جتنی خوشیاں ملیں، انہیں سمیٹ لینا چاہئے۔ ان مسرتوں کے گزر جانے کے بعد یوں لگتا ہے، جیسے خواب دیکھ رہے تھے۔

ہم پیار و محبت کی دوسری رات گزارنے اپنے مکان میں آئے۔ اس علاقے میں ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آزادی کے موقع پر شائع ہونے والے اخبارات نے گزرے ہوئے ہندو مسلم فسادات کی کئی لرزہ خیز تصاویر شائع کی تھیں اور لکھا تھا۔ ''ہندو قوم نے مسلمانوں کے بے حد و حساب مظالم برداشت کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کے بعد اپنے دیس کو آزاد کرایا ہے''۔

ان اخباری تصاویر کے ذریعے متعصب لوگوں نے پھر اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کو بھڑکانے کی کوششیں کیں۔ کسی بھی قوم کا کوئی

شریف آدمی اپنے بیوی بچوں کو گھر میں چھوڑ کر دوسروں کی بیویوں اور بچوں کو مارنے نہیں آتا۔ ایسا صرف موقع پرست بدمعاش کرتے ہیں تاکہ لوٹ کھسوٹ میں زیادہ سے زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آئے۔

ہمارے محلے میں آباد ہونے والے شرنارتھی ہم مسلمانوں کو نفرت سے دیکھتے رہتے تھے۔ وہ ہمارے خلاف کچھ بھی کر سکتے تھے۔ کچھ بزرگ حضرات میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''بیٹے! تم کانگریسی ہو۔ ہماری خواتین اور بچوں کی حفاظت کے انتظامات کرا سکتے ہو۔ بے شک ہم کانگریسی مسلمانوں کو گالیاں دیتے تھے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلم لیگ کے بندے ہمیں بے یارومددگار چھوڑ جائیں گے۔ انہوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ غریب مسلمان اپنے پورے خاندان کے ساتھ ہجرت کے اخراجات کیسے برداشت کریں گے؟ بیٹے! تم کچھ کرو''۔

میں نے کہا۔ ''آپ حضرات اطمینان رکھیں۔ ہمارے چیئرمین شرما جی نے تھانے والوں کو سختی سے تاکید کی ہے۔ ہم مسلمانوں کے تمام محلوں میں سپاہی رات کے وقت پہرا دیا کریں گے۔ آپ رات کو کبھی دروازہ نہ کھولیں۔ کوئی پریشانی ہو تو چھت پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو پکارا کریں۔ اس طرح سپاہی بھی مدد کرلئے پہنچ جایا کریں گے۔ حملہ کرنے والوں کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم راتوں کو گھر کے اندر جاگتے رہتے ہیں''۔

میں نے انہیں تسلیاں دے کر رخصت کر دیا لیکن خود مطمئن نہیں تھا۔ ہندو میرے دوست نہیں تھے اور جو دوست نہیں تھے، وہ آسیب کی طرح حواس پر چھائے ہوئے تھے۔ ویسے حالات کا تجزیہ کیا جائے تو دنگا فساد اور خون خرابہ کرنے والے نہ ہندو تھے، نہ مسلمان، نصف صدی کے اختتام پر مخصوص سیاسی مہرے پیدا کئے گئے تھے۔ حکومت شیخ کی ہو یا برہمن کی، اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے غنڈوں کا وجود لازمی قرار پا گیا تھا۔

میں شبو کی وجہ سے سہما سہما سا رہتا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ تنہا ہوتا تو برے وقت میں بھاگ کر کانگریسی بھائیوں کی پناہ میں پہنچ جاتا لیکن ایک حسین اور جوان عورت کو ساتھ لے کر گھر سے نکلتے ہی چاروں طرف سے اندیشے گھیر لیتے تھے۔ حوصلہ کہتا تھا، ہمارے ساتھ ہماری عورت کی جان جائے، آبرو نہ جائے۔ یہ برداشت ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ہماری عزت کو کوئی دوسرا ہاتھ لگائے۔

میں نے موجودہ حالات میں شادی کر کے عورت کی پہرے داری قبول کر لی تھی۔ میں دن کو کہیں بھی کام کاج میں مصروف رہتا تو ہزار مصروفیات کے باوجود شبو کی طرف دھیان لگا رہتا تھا۔ وہ اسی محلے میں پیدا ہوئی تھی۔ وہیں جوان ہوئی تھی۔ وہاں کے ایک ایک گھر سے واقف تھی۔ مگر اب ہر گھر میں اجنبی تھے۔ ہر قدم پر خوف تھا۔ ہر گھر ایک کمان تھا۔ کسی بھی گھر سے کسی بھی وقت تیر چل سکتے تھے۔ ہر مرد کی نگاہ اسے کہتی تھی۔ ''میری جان! تم ہمارا دل خوش کرنے کے لیے اس محلے میں رہ گئی ہو''۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسلمان کی جورو سب کے منہ سے رال کی طرح ٹپکنے لگے گی۔ سامنا ہوتا تو سب دوست اور ہمدرد نظر آتے تھے۔ یہ پتا نہیں چلتا تھا، کون شریف ہے اور کون بدمعاش؟ رام رام جپنا، پرایا مال اپنا کہنے والے بہت تھے۔ مگر ایسا زبان سے کوئی نہیں کہتا تھا۔ میں اندھیرا ہونے سے پہلے گھر آ جاتا تھا۔ وہ پوچھتی تھی۔ ''تم اور پہلے نہیں آ سکتے؟''

میں اپنی مصروفیات کے سلسلے میں سمجھاتا تھا۔ مگر سمجھانے سے کیا ہوتا ہے؟ ایک دن ایک پتھر کھڑکی سے آ کر لگا۔ شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ شبو چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اسے لئے ہوئے کھڑکی کے پاس آیا۔ پھر دیوار کی آڑ میں رہ کر گرجتے ہوئے بولا۔ ''یہ چنڈال کون ہے؟ تم سب اچھی طرح جانتے ہو، میں کانگریسی ہوں۔ میں پتھر کے جواب میں جیل بھجوا سکتا ہوں''۔

کچھ لوگوں کے قہقہے سنائی دیئے۔ میں نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے پار دیکھا۔ گلی کے موڑ پر چار آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ''کیوں چلا رہا ہے کانگریس کے کتے؟ کسی بچے نے پتھر پھینکا ہوگا۔ ہم اکالی دَل کے سیوک ہیں۔ پتھر نہیں مارتے، چھرا گھونپ کر نالے میں پھینک دیتے ہیں''۔

دوسرے نے کہا۔ ''جندگی چاہتا ہے تو شرما کا ساتھ چھوڑ دے''۔

تیسرے نے کہا۔ ''کانگریس سے نکل جا......''

چوتھے نے کہا۔ ''پاکستان بھاگ جا۔ نہیں تو کتے کی موت مرے گا''۔

پھر وہ جے مہا کالی کے نعرے لگانے لگے۔ ان دنوں ٹیلی فون کی سہولت نہیں تھی ورنہ میں کانگریسی بھائیوں کو آواز دیتا تو وہ میری مدد کو دوڑے چلے آتے۔ وہ نعرے لگانے والے شر پسند تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔ ہم بہت دیر تک چارپائی پر بیٹھے رہے۔ لالٹین بجھا دی تھی۔ بجلی کی روشنی ریلوے افسران کے بنگلوں میں یا خاص سڑکوں کے کنارے ہوا کرتی تھی۔ وہ کمرے کے گھپ اندھیرے میں مجھ سے لگی بیٹھی رہی۔ میں نے اسے تسلیاں دیں۔ اس کا دھیان بٹانے کے لیے پیار کرنے لگا۔ وہ محبت کا جواب سرد مہری سے دیتی رہی۔ حالات نے باہر سے اسے قریب لا کر اندر سے دور کر دیا تھا۔ میں اس کا دوست تھا لیکن اس کے دل و دماغ پر دوست سے زیادہ دشمن پنجے گاڑ رہے تھے۔

میں نے دوسرے دن شرما جی سے شکایت کی۔ وہ میرے ساتھ تھانے تک آئے۔ انسپکٹر سے کہا۔ ''یہ اکالی دَل والے غنڈا گردی پر اتر آئے ہیں۔ کانگریسی بھائیوں کے گھروں میں پتھر مارتے ہیں اور انہیں بھاگ جانے کو کہتے ہیں۔ پلیز، آپ امام بھائی کے گھر کے سامنے سپاہیوں کی ڈیوٹی لگائیں''۔

انسپکٹر نے کہا۔ ''اتنے بڑے علاقے کے تھانے میں دو بندوقیں ہیں۔ میرے پاس ایک ریوالور ہے۔ جس میں صرف تین گولیاں رہ گئی ہیں۔ میں اب تک چار عرضیاں بھیج چکا ہوں کہ کارتوس اور بندوقیں سپلائی کی جائیں۔ مگر کوئی شنوائی نہیں ہے۔ دیس کی حالت بڑی خراب ہے۔ سرکاری خزانہ خالی ہے''۔

''آپ دیس کی خراب حالت پر کمنٹری نہ کریں۔ امام بھائی کے لیے سیکورٹی فراہم کریں''۔

''کروں گا۔ مگر سپاہی ہاتھوں میں لاٹھی لے کر پہرہ دیں گے۔ کیا حملہ کرنے والے غنڈے لاٹھیوں سے ڈر جائیں گے؟''

''آپ سپاہیوں کو یہاں خالی بندوقیں دے دیں۔ غنڈے یہ نہیں جان پائیں گے کہ بندوقیں خالی ہیں''۔

''حملہ کرنے والے جان جائیں گے''۔

''میں کہتا ہوں، نہیں جان سکتے''۔

''اور میں کہتا ہوں، جا سکتے ہیں''۔

''کیسے؟''

''ایسے کہ میں خود اکالی دَل کا سیوک ہوں''۔

شرما جی نے حیرانی سے انسپکٹر کو دیکھا۔ ٹھنڈے پڑ کر بولے۔ ''آپ سرکاری ملازم ہیں۔ آپ کو کسی پارٹی میں نہیں ہونا چاہیے''۔

''میں صرف سرکاری ملازم ہی نہیں، ایک سچا ہندوستانی بھی ہوں۔ ان مسلمانوں نے پاکستان بنا کر ہمارے دیس کے ٹکڑے کر دیئے اور آپ ان کی حمایت میں ہمارے اکالی دَل کے بھائیوں کی مخالفت کر رہے ہیں؟ کیا آپ سچے ہندوستانی اور دیس بھگت کہلانے کے لائق ہیں؟''

''یوشٹ اَپ...... میں ابھی تمہارے اعلیٰ افسران سے شکایت کروں گا''۔

''میری شکایت اوپر جائے گی تو یہ بھی نئی دلہن کے ساتھ اوپر پہنچ جائے گا۔ آپ کانگریسی ہیں، ہندوستان کے حاکم لیکن ہماری قسمت کے مالک نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ یہاں کے مسلمانوں کی وکالت نہ کریں''۔

''میں تمام مسلمانوں کا ٹھیکے دار نہیں ہوں۔ صرف اپنے ورکر امام بھائی کا تحفظ چاہتا ہوں''۔

''ٹھیک ہے، میں اکالی بھائیوں کو سمجھا دوں گا۔ اسے اور اس کی لگائی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے''۔

میں نے کہا۔ ''شرما جی! آپ صرف میری جان کو نہ دیکھیں۔ محلے کے کسی ایک مسلمان کو بھی جان یا مالی نقصان پہنچے گا تو مجھ سے دیکھ نہیں جائے گا''۔

شرما جی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تھانے سے باہر لائے۔ پھر بولے۔ ''امام بھائی! اچھا برا وقت سمجھا کرو۔ اکالی دَل والے ڈنکے کی چوٹ پر الزام دیتے رہتے ہیں کہ ہم کانگریسی ہندوستان کے ٹکڑے کرنے والے مسلمانوں کو آستین کے سانپ کی طرح پال رہے ہیں۔ میں ان حالات میں صرف تمہاری اور بھابی کی مدد کر سکتا ہوں۔ کسی تیسرے مسلمان کی حفاظت کی ذمے داری لینا میرے بس کی بات نہیں ہے''۔

''شرما جی! میں پہلے مسلمان ہوں، پھر ہندوستانی ہوں۔ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرے گا کہ میں ایک ہی محلے میں محفوظ رہوں اور میرے دوسرے بھائی مارے جائیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں، ہماری کانگریسی پارٹی کی ہائی کمان سے رابطہ کریں۔ پنڈت جی (جواہر لال نہرو) آپ کے نام سے اور کام سے واقف ہیں۔ آپ ہمارے حالات بتائیں گے تو ہم مسلمانوں کے لیے ضرور حفاظتی انتظامات کئے جائیں گے''۔

''اچھا اچھا۔ میں تم سب کے لیے کچھ کروں گا، اب یہاں سے چلو''۔

● ● ●

میں وہاں سے چلا آیا۔صبح جب گھر سے نکلا تو شبو سہمی ہوئی تھی۔اتنے بڑے مکان میں تنہا نہیں رہنا چاہتی تھی۔وہاں ایک مسلمان خاندان سے برسوں کی واقفیت تھی۔میں اسے وہاں چھوڑ آیا تھا۔جب محلے میں داخل ہوا تو شراب کی بھٹی کے پاس انہی چار غنڈوں میں سے ایک نے میری طرف تھوک دیا۔دوسرے نے کہا۔''سالا اپنے باپ کو لے کر تھانے گیا تھا۔بول مچھندر! اس کے پیٹ میں چھرا گھسا دوں؟''

تیسرے نے کہا۔''جانے دے یار! اس کی لگائی، جس گھر میں گئی تھی، وہاں ہم نے بدلہ لے لیا ہے۔اس کے لیے اتنی سزا کافی ہے''۔

یہ سنتے ہی میں تیزی سے دوڑتا ہوا اس گھر میں آیا جہاں شبو کو صبح چھوڑ گیا تھا۔وہاں عورتیں رو رہی تھیں۔ایک بوڑھی خاتون دروازے پر کھڑی چھاتی پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی۔''مار ڈالو۔ہم سب کو مار ڈالو۔ہمارے آدمیوں کو مار ڈالا ہے تو ہمیں زندہ کیوں چھوڑ گئے ہو؟''

میں مکان کے اندر آیا۔آنگن میں ایک بزرگ اور دو جوان بیٹوں کی خون آلود لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ایک کمرے میں شبو دو عورتوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔میں نے کہا۔''شبو! تم یہاں رہو، میں ابھی شرما جی اور تھانے دار کو بلا کر لاتا ہوں''۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔''میں نہیں رہوں گی۔کیا تم نے اسی دن کے لیے مجھ سے شادی کی تھی؟ یہ لوگ کہتے ہیں، میں یہاں نہ آتی تو قاتل بھی نہ آتے۔حملہ کرنے والے صاف کہہ رہے تھے کہ تم کانگریس اور قانون کا سہارا لے رہے ہو۔تمہیں سزا دینے کے لیے ان کی جانیں لی گئی ہیں۔میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہوں گی، میں تمہارے ساتھ جاؤں گی''۔

وہ چادر لپیٹ کر مکان کے باہر جا کر کھڑی ہوگئی۔میں اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہوگیا۔اپنے مکان میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔دوسروں کے ہاں چھوڑ کر جانے کا نتیجہ دیکھ چکا تھا۔راستے میں جگہ جگہ غنڈے بدمعاش موجود تھے۔میں شبو کا ہاتھ پکڑ کر جا رہا تھا۔وہ آوازیں کس رہے تھے۔محلے کے باہر جانے سے پہلے ہی انسپکٹر چند سپاہیوں کے ساتھ آگیا۔میں نے کہا۔''میں آپ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ظالموں نے بڑی بے رحمی سے ایک ہی گھر کے......''

انسپکٹر نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روکتے ہوئے کہا۔''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔میں وہیں جا رہا ہوں۔تم اپنی گھر والی کو یہاں سے لے جاؤ''۔

شبو کو اِدھر سے اُدھر ساتھ لے کر جانا مناسب نہیں تھا۔میں نے کہا۔''آپ سے التجا کرتا ہوں، ان کے قاتلوں کو ضرور گرفتار کریں''۔

''جن کے مرد مارے گئے ہیں، میں ان کی عورتوں کو تسلیاں دے سکتا ہوں لیکن اپنے اکالی بھائیوں کو گرفتار نہیں کروں گا''۔

میں اس کی صاف گوئی پر اسے بے بسی سے دیکھنے لگا۔وہ بولا۔''تمہارے شرما جی کا سالا بھیم سین بڑا خطرناک غنڈا کہلاتا ہے۔جب وہ واردات کرتا ہے تو شرما جی اسے قانون کی گرفت سے بچا لیتے ہیں۔تم کیا سمجھتے ہو، میں اپنے اکالی دَل کے قاتل بھائیوں کو پکڑ کر سزا دلاؤں

گا؟ ہرگز نہیں، شرما جی کی لیڈری ان کے غنڈوں سے اور میری انسپکٹری میرے غنڈوں سے قائم ہے''۔

وہ سپاہیوں کے ساتھ اس مکان کی طرف چلا گیا جہاں سے میں شبو کو لے کر آرہا تھا۔ میں نے شرما جی کے پاس آ کر ساری روداد سنائی پھر کہا۔ ''میں کسی کے خلاف شکایت لکھوانا نہیں چاہتا۔ شکایت کرنے سے مسلمانوں کو اور زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ میں وہ مکان اور محلہ چھوڑ دوں گا''۔

وہ خوش ہو کر بولے۔ ''یہ تم نے عقلمندی کی بات کی ہے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی حمایت کرنے سے ہندو مجھ سے بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔ تم لوگ مٹھی بھر ہو۔ میں تم لوگوں کے ذریعے نہیں، اپنے ہندو بھائیوں کی حمایت سے اسمبلی میں پہنچوں گا''۔

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''میں سیاست کو نہ سمجھ سکا۔ اگر سمجھتا تو کسی بھی پارٹی کا ورکر نہ بنتا''۔

''دل چھوٹا نہ کرو۔ میرے سالے بھیم سین نے بے شمار مکانات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ تمہیں ایک مکان رہنے کے لیے دے دے گا''۔ بھیم سین سے میری اچھی دوستی تھی۔ شام کو اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے گلے سے لگا لیا پھر کہا۔ ''امام بھائی! میں اکالی دل کے گنڈوں کو جندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ لو چابیاں میرے آدمی کے ساتھ جاؤ۔ وہ تمہیں رہنے کو ایک مکان دے دے گا''۔

وہ چھ فٹ کا قد آور پہلوان تھا۔ رنگ سیاہ تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے شیطان جھانکتا تھا۔ شہر کے تمام غنڈے اس کی جی حضوری کر کے شرما جی کے اثر رسوخ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔

اس کے آدمی شبو کے مکان سے تمام سامان نئے مکان میں لے آئے۔ اس محلے کے غنڈوں سے کہہ دیا گیا کہ شبو کا مکان برائے فروخت ہے۔ کوئی اس پر قبضہ نہ جمائے ورنہ بھیم سین کے علاقوں میں جو اکالی دل والے ہیں، ان سب کی لاشیں گرا دی جائیں گی۔

میں شبو کے ساتھ نئے محلے اور نئے مکان میں رہنے لگا۔ وہاں آرام اور اطمینان تھا۔ حملہ آوروں کا خوف نہیں تھا لیکن سامنے والے مکان میں بھیم سین کی چنڈال چوکڑی جمی رہتی تھی۔ راتوں کو ناچ گانا ہوتا تھا۔ شراب اور شباب کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ وہ ہر رات کہیں نہ کہیں سے لڑکیاں اٹھا کر لے آتے تھے۔ اس مکان سے کبھی کبھی نسوانی چیخیں سنائی دیتی تھیں، پھر فاتحانہ قہقہوں میں وہ چیخیں دب کر رہ جاتی تھیں۔

شبو نے کہا۔ ''ہم آسمان سے گرے اور کھجور میں آ کر اٹک گئے۔ مجھے ایسی چیخیں سن کر وحشت سی ہوتی ہے''۔

میں نے کہا۔ ''بھیم سین کو ایسی حرکتیں کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ جو کرتا ہے، کرنے دو۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو؟ کسی عورت کی چیخیں سنائی دیتی ہیں تو میں شرم سے مر جاتی ہوں۔ تصور میں دیکھتی ہوں کہ اس پر کیا گزر رہی ہوگی؟ کیا بھیم سین جیسے بدمعاشوں کے لیے کوئی قانون نہیں ہے؟''

''قانون ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ تم رات کے وقت کانوں میں روئی ٹھونس لیا کرو۔ رفتہ رفتہ ایسی باتوں کی عادی ہو جاؤ گی''۔

ان دنوں اس کا پاؤں بھاری تھا۔ ماں بننے والی تھی۔ ایسی حالت میں اس کی دیکھ بھال کے لیے پریشان رہتا تھا۔ وہ موجودہ ماحول سے پریشان رہتی تھی۔ بھاوج نے وعدہ کیا تھا کہ زچگی کا وقت آئے گا تو وہ کسی دائی کو لے کر پہنچ جائیں گی۔ ان کی باتوں اور محبتوں سے ڈھارس

بندھی ہوئی تھی۔

لیکن زچگی کا دن قریب آیا تو فسادات شروع ہو گئے۔ پہلے ہندو مسلم فسادات ہوا کرتے تھے۔ اب ہندو آپس میں لڑنے مرنے لگے۔ یہ سیاسی لڑائیاں کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی پارٹی بندی کے نام پر ہوتی ہیں۔ ایسی لڑائیوں میں فوج نہیں ہوتی، پولیس تماشائی ہوتی ہے اور سادہ لوح عوام اپنی اپنی پارٹی کی قوت اور مقبولیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کو قتل نہیں کرتے، قتل مختلف پارٹیوں کے پروردہ غندے کرتے ہیں۔

ان حالات میں بھاوج نہ آسکیں۔ کوئی دائی بھی گھر سے نکلنے کو تیار نہیں تھی۔ میں بلوائیوں سے بچتا ہوا کتنے ہی علاقوں میں گیا۔ ادھر شبو دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ ایسی جان لیوا تکلیف کے وقت کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھنے والا اور اسے حوصلہ دینے والا نہیں تھا۔ ایک محلے میں بھیم سین سے سامنا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''امام بھائی! یہاں کیوں مرنے آئے ہو۔ گلی گلی میں چھرا گھونپنے والے چھپے ہوئے ہیں''۔

میں نے شبو کی حالت بتائی، وہ بولا۔ ''پہلے کہا ہوتا کہ ہماری بھرجائی کو دائی ماں کی جرورت ہے، ابھی لو''۔

وہ دوسری گلی کے ایک مکان میں گیا۔ وہاں سے ایک عورت کو کاندھے پر اٹھا لایا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ جانے سے انکار کر رہی تھی لیکن اس نے میرے دروازے پر پہنچ کر ہی اسے کاندھے سے اتارا۔ میں نے اس عورت کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ماں جی! ہمارا کوئی نہیں ہے۔ میری بیوی تنہا زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ دیتا ہوں۔ ہماری مشکل میں کام آجائیں''۔

میری بات ختم ہوتے ہی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ دائی ماں تیزی سے اندر چلی گئی۔ بھیم سین نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''واہ بھئی واہ! تم تو ایک بچے کے باپ بن گئے۔ ہمارا تو کوئی حساب نہیں ہے۔ یہ جو شہر کی گلیوں میں بچے کھیلتے رہتے ہیں، ان میں کتنے ہمارے ہیں، یہ تو ان کی مائیں جانتی ہیں'' ہاہاہاہا......''

وہ قہقہے لگاتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دائی ماں نے آکر کہا۔ ''تمہاری عورت بڑی ہمت والی ہے۔ کوئی اور ہوتی تو مر جاتی۔ بے چاری نڈھال ہو گئی ہے۔ اسے اچھا کھلاؤ، پلاؤ۔ پھر سے تندرست بناؤ''۔

''بیٹی ہے یا بیٹا؟''

''بیٹی۔ بہت سندر ہے۔ راجکماری لگتی ہے''۔

میں نے اسے بیس روپے دیے۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے اندر آکر شبو کو پیار کیا۔ پھر بیٹی کو ہاتھوں میں اٹھا کر چومنے لگا۔ بیٹی کی ماں بڑے فخر سے مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ باہر قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ آدمی، آدمی کی جان لے رہا تھا۔ مرد بھی کیا ہے؟ عذاب دیتا ہے، عورت عذاب سہتی ہے اور انسان کو جنم دیتی ہے۔ چیلنج کرتی ہے، تم انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹاتے رہو، میں انسانوں کو صفحۂ ہستی پر نقش کرتی رہوں گی۔ شبو ماں بن کر تکلیف بھول گئی تھی۔ کاش! ہم تکلیف دینا بھول جاتے۔

● ● ●

پھر دن گزرنے لگے۔ میری بیٹی زلیخا چھ ماہ کی ہوگئی۔ شبو پھر پہلے کی طرح صحت مند ہوگئی تھی۔ ایک بچی کے بعد رنگ روپ زیادہ نکھر آیا تھا لیکن اس کا حسن و شباب مجھے اندیشوں میں مبتلا کرتا رہتا تھا۔ پھر یہ سوچ کر ذرا اطمینان ہوتا تھا کہ وہ پردے کی پابند ہے۔ میرے ساتھ برقع پہن کر کہیں جاتی آتی ہے۔

ایک رات میں گھر پر نہیں تھا۔ شبو نے تقریباً دس بجے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں، پھر کوئی دروازہ پیٹنے لگا۔ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو۔ مجھے اندر آنے دو۔ مجھے بچاؤ، بھگوان کے لیے مجھے درندوں سے بچاؤ''۔

شبو نے کھڑکی سے دیکھا۔ ایک لڑکی بہت پریشان اور سہمی ہوئی دکھائی دی۔ وہ تنہا تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک دم سے لپٹ کر بولی۔ ''تم میری بہن ہو۔ مجھے بھیم سین سے بچاؤ۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی''۔

بھیم سین کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''سالی بھاگ کر ہمارے ہی گھر میں چھپنے آئی ہے''۔

وہ چار بدمعاشوں کے ساتھ آرہا تھا۔ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر شبو کو دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس نے پہلی بار اسے برقع سے باہر دیکھا تھا اور ایک ٹک دیکھتا ہی جارہا تھا۔ شبو نے پوچھا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی؟ یہ ہندو گھرانے کی لڑکی ہے اور تم ہندو ہو کر اس کی عزت لوٹنا چاہتے ہو؟''

''بھیم سین نے پوچھا۔'' کیا تم امام بھائی کی پتنی ہو؟''

''ہاں، میں ان کی شریکِ حیات ہوں''۔

وہ حیرانی سے بولا۔ ''اری ہو تو اب تک نجر کیوں نہیں آئیں۔ سالی اتنی سندر عورت میرے بگل میں چھپی رہی اور میرے کو کھبر نہیں ہوئی ہے۔ تھو ہے میری جندگانی پر......''

اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''منہ کیا دیکھتے ہو، لے جاؤ اس چھوکری کو۔ آرام سے بانٹ کر کھالو''۔

انہوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے لگے۔ شبو اسے بچانے کے لیے آگے بڑھی تو بھیم سین نے اسے دبوچ لیا۔ اسے اٹھا کر مکان کے اندرونی حصے میں لے جانے لگا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔ اسے گالیاں دے رہی تھی۔ مگر اس گینڈے سے خود کو چھڑا نہیں پارہی تھی۔ اس لڑکی نے بس اتنا ہی دیکھا اور اتنا ہی مجھے بعد میں بتایا۔ میری شبو پر کیا گزری؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ جب میں وہاں پہنچا تو قیامت گزر چکی تھی۔ اس شرم والی نے چھت سے رسی لٹکا کر گلے میں پھندا ڈال لیا تھا۔ شرم سے منہ چھپا کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

میں چکرا کر گر پڑا۔ میری آنسو بھری آنکھوں کے سامنے وہ چھت سے بے جان لٹکی ہوئی تھی۔ نیچے فرش پر میری بچی ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر رو رہی تھی۔ ماں کو دودھ کے لیے پکار رہی تھی۔ میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟ جو ہو چکا ہے، وہ حقیقت ہے؟ شبو مر گئی ہے یا ابھی تک اندیشوں میں رہ کر تصور میں ایسی بھیانک اور غیر انسانی واردات دیکھ رہا ہوں؟

کوئی عورت میری بچی کو اٹھا کر لے گئی تھی۔ شاید پولیس والوں نے شبو کی لاش کی پھندے سے اتارا تھا۔ لوگ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے۔ مجھے جھنجھوڑ رہے تھے۔ مجھے ہوشمندی کی طرف لانے کے لیے میرے منہ پر طمانچے مار رہے تھے۔ مجھے یہ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔

میں کھلی آنکھوں سے خوابیدہ تھا۔ منہ پر طمانچے بڑ رہے تھے۔ مگر تکلیف کا احساس مر گیا تھا۔ میں اس دنیا میں تھا مگر دنیا کے لیے میں اور میرے لیے دنیا مر چکی تھی۔

مجھے ہسپتال پہنچایا گیا۔ مسجد کمیٹی کے افراد شبو کی لاش لے گئے۔ میں دو ہفتے تک اپنے آپ سے غافل رہا۔ ایک دن ہسپتال سے بھاگ گیا۔ سڑکوں کے کنارے پھرا چتا رہا اور جے ہند کے نعرے لگا تا رہا۔ پھر میرے کانگریسی دوست مجھے پکڑ کر بھاوج کے پاس لے آئے۔ وہ میری بچی کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ میری حالت دیکھ کر روتی ہوئی بولیں۔ ''بھگوان جانتا ہے، بھیم سین کو بھائی کہتے ہوئے شرم سے مرجاتی ہوں۔ اس نے جو کیا ہے، اس کی سزا او پر والا دے گا۔ دیکھو، میں تمہاری زلیخا کو سینے سے لگا کر رکھتی ہوں۔ ہوش میں آ جاؤ بھائی! میرا کلیجہ کٹ رہا ہے''۔

بھاوج نے مجھے اپنے ہاں ایک کمرے میں بند کرا دیا۔ توجہ سے علاج کرانے لگیں۔ وہ دن رات میرا خیال رکھتی تھیں۔ ملازم مجھے غسل کراتے اور لباس پہنایا کرتے تھے۔ وہ وقت پر مجھے دوائیں پلاتی تھیں۔ میرے کھانے پینے کا دھیان رکھتی تھیں۔ ان کی محبت اور ممتا کے باعث میں رفتہ رفتہ ہوش میں آنے لگا۔

اچھا ہوتا اگر ہوش میں نہ آتا۔ غفلت کی زندگی میں شبو کو بھول چکا تھا۔ اب وہ یاد آئی تو اس کی موت کا منظر بھی یاد آیا۔ اس کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا مجھے تڑپانے لگی۔ میں صدمات کو کم کرنے کے لیے زلیخا کو سینے سے لگا لیتا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ دن رات جہاں بھی جاتا، اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

میں نے اس گھر میں قدم نہیں رکھا، جہاں شبو کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ جنون میں آ کر سوچتا تھا، ایک بار بھیم سین سے سامنا ہو جائے، میں اس پہاڑ سے ٹکرا جاؤں گا۔ بلا سے مرجاؤں مگر اسے مار ڈالنے کی آخری کوشش ضرور کروں گا۔

● ● ●

گلریا کا آدم خور

گلریا کا آدم خور برٹش آرمی کے ایک سابق بریگیڈئیر جمشید ار جاسپ خان کیانی کی آپ بیتی ہے، جسے عبیدہ اللہ بیگ نے کہانی کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ **گلریا کا آدم خور** ۴۰ کی دہائی کی ایک شکاری مہم ہے جو ایک طرف اُس وقت کے راجھستان اور راجھستانی راجاؤں کی آن بان کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی راہ میں آنے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور ان دیکھی قوتوں کی پس پردہ سازشوں سے نقاب اُٹھاتی ہے۔ اس داستان میں بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جو اس خطہ کے جغرافیائی نقشہ کو کسی اور ہی رخ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب آپ بہت جلد کتاب گھر پر دیکھ سکیں گے۔

ایک روز بھاوج نے مجھے پچاس ہزار روپے دیئے اور کہا۔ ''تمہاری شبو کا مکان فروخت کرنے سے یہ رقم لی ہے۔ امام بھائی! مجھے بڑی بہن سمجھ کر میری ایک بات مان لو''۔

''آپ کی ہر بات میں ممتا ہے، فرمایئے''۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ''پاکستان چلے جاؤ''۔

میں ان کا منہ تکنے لگا۔ شرماجی نے کہا۔ ''ہم مانتے ہیں، تم نے اس دیس سے محبت کا ثبوت دیا ہے۔ قربانیاں بھی دی ہیں۔ جسمانی اور دماغی اذیتیں بھی برداشت کی ہیں۔ ہم تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتے لیکن زلیخا کی بہتری کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں''۔

بھاوج نے کہا۔ ''پاکستان میں زلیخا کو دادی، اور نانی، نانا کی توجہ اور پیار ملے گا۔ یہ بچی اپنوں میں رہ کر پرورش پائے گی۔ اس کی آئندہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے پاکستان چلے جاؤ''۔

میں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ وہ دونوں بڑی دیر تک بولتے رہے اور مجھے سمجھاتے رہے۔ پھر شرماجی نے پوچھا۔ تم خاموش کیوں ہو، جواب دو؟''

پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ سب کی سنتا تھا۔ مگر بولتا نہیں تھا۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں زلیخا کو گود میں لے کر اٹھ گیا۔ وہاں سے جانے لگا۔ بھاوج نے گہرے صدمے سے کہا۔ ''بے چارے کے دل پر بوجھ ہے۔ گونگا بن کر رہ گیا ہے''۔

شرماجی نے کہا۔ ''یہ ایسے رہے گا تو بچی کسی مصیبت میں پڑ جائے گی''۔

میں گھر سے باہر آ گیا۔ میرے شانے سے ایک بیگ لٹکا رہتا تھا جس میں زلیخا کا دودھ، فیڈر اور ضروری سامان رکھا رہتا تھا۔ میں اسے صبح سے شام تک گود میں لئے جانے کہاں بھٹکتا رہتا تھا۔ بھاوج کہتی تھی۔ ''تم بچی کو لیے دھوپ میں کہاں گھومتے رہتے ہو۔ تمہارا من مزاج ٹھکانے نہیں رہتا ہے۔ کہیں اسے اِدھر اُدھر چھوڑ کر بھول نہ جانا''۔

میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اب تو وہی میری سب کچھ تھی۔ ایک دن میں ریلوے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ وہاں سیمنٹ کے بنے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام سے رات ہو گئی۔ میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ میرے آباؤ اجداد صدیوں سے جس زمین پر رہتے آئے تھے، اسے چھوڑ کر جانے کے خیال سے یوں لگتا تھا جیسے میں خود ہی اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکا رہا ہوں۔ میرے سر پر ہندوستانی آسمان نہیں رہے گا۔ کیا پاکستانی آسمان سے بھی ایسے ہی عذاب نازل ہوا کریں گے؟ میں وقت سے پہلے کیسے سمجھ سکتا تھا؟ ایک نئی زمین پر محبت اور مشقت سے پسینہ بہا کر دیکھا جا سکتا تھا کہ زمین کتنی سیراب ہوتی ہے؟ آسمان کتنا مہربان ہوتا ہے؟

ان دنوں دونوں ملکوں کی سرحدیں کھلی ہوئی تھیں۔ پاسپورٹ یا شناختی کاغذات کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہزاروں لاکھوں روپے کا تبادلہ آسانی سے ہو جاتا تھا۔ میں دہلی سے امرتسر آیا۔ وہاں سے لاہور پہنچ گیا۔ لاہور میں ریلوے کا بہت بڑا ورکشاپ ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کے مسلمان، جو ریلوے ملازمین تھے۔ وہ سب ہجرت کر کے لاہور کی اسی ریلوے کالونی میں آئے تھے۔

وہاں ریلوے کے کسی ملازم کو ڈھونڈ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں ریلوے ورکشاپ میں گیا تو ابا جان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر آئے تھے لیکن خلاف توقع مجھے سامنے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ مجھے گلے سے لگا لیا۔ میرے حالات پوچھنے لگے، میں نے کہا۔ ''گھر میں باتیں ہوں گی''۔

انہوں نے زلیخا کو میری گود میں دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ تمہاری بیٹی! میری پوتی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ زلیخا کو مجھ سے لیکر پیار کرتے ہوئے بولے۔ ''کیا شبو کو اسٹیشن کے مسافر خانے میں چھوڑ آئے ہو؟''

میں نے آہستگی سے کہا۔ ''گھر میں باتیں ہوں گی''۔

وہ چونک کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے زلیخا کو ان کی گود سے لیا پھر پلٹ کر ورکشاپ سے باہر جانے لگا۔ ابا جان سر جھکا کر میرے ساتھ ہو گئے۔ میں گھر جاتے وقت پچھتا رہا تھا۔ ''کیوں آ گیا؟ یہ کیوں نہ سوچا کہ شبو کے سلسلے میں میرا محاسبہ ہوگا؟''

میرے جذباتی فیصلوں نے اور زخمی تجربات نے سمجھایا، میں خود نہیں آیا۔ مجھے ٹھوکریں ماری گئیں، میں سرحد کے اس پار آ کر گر پڑا۔ آدمی وہیں آ کر گرتا ہے، جہاں جھک کر اٹھانے والے ہوں۔ اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ لوگ صرف اٹھانے کے لیے نہیں جھکتے، منہ پر تھوکنے کے لیے بھی جھکتے ہیں۔

گھر پہنچا تو اماں بی مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ خوشی سے روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آمد کی خبر سن کر دوسرے کمروں سے کئی رشتے دار چلے آئے۔ ممانی اور ماموں بھی آئے ہوئے تھے۔ ممانی خوش ہو کر دعائیں دینے لگیں۔ ادھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ماموں نے مجھے گلے سے لگا لیا پھر پوچھا۔ ''ہماری شبو کہاں ہے؟''

میں نے ان سے الگ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ سر کو جھکا لیا۔ ندامت ایسی تھی کہ جواب دینے کے لیے منہ نہیں کھل رہا تھا۔ ممانی نے تڑپ کر پوچھا۔ ''تم نے آنکھیں کیوں بند کر لیں؟ بولتے کیوں نہیں؟''

میری بادآنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہی آنسو جواب بن گئے تھے۔ سب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ پھر ممانی اور اماں بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابا جان، بھائی، بھابی اور پھوپا مجھے طعنے دینے لگے۔ میں نادم تھا۔ مگر طعنے سننے نہیں آیا تھا۔ اپنی زلیخا کو اماں بی کی گود سے لے کر جانا چاہتا تھا۔ انہوں نے راستہ روک کر پوچھا۔ ''کہاں جا رہا ہے؟''

میں غصے سے پھٹ پڑا۔ ''مجھے ایسے طعنے دیے جا رہے ہیں، جیسے میں اپنی شبو کا قاتل ہوں۔ کیا ہم سب کو ایک دن مرنا نہیں ہے۔ شبو کو بھی ایک دن اپنے معبود کی طرف لوٹنا تھا لیکن یہ ایسے طعنے دے رہے ہیں جیسے قیامت تک زندہ رہنے کے لیے آئے ہیں''۔

ممانی جان زلیخا کو مجھ سے لے کر یوں چومنے لگیں جیسے اپنی شبو کو کلیجے سے لگا کر اپنے صدمات سے لڑ رہی ہوں۔ ماموں جان نے کہا۔ ''ہماری بیٹی کی اتنی ہی زندگی تھی۔ ہمیں صبر کرنا ہوگا''۔

ابا جان نے پوچھا۔ ''کیا وہ بیمار تھی؟ کیسے انتقال ہوا؟''

''میں نے کہا۔''جو ہوا، اس پر صبر کریں''۔

بھائی جان نے کہا۔''صاف ظاہر ہے، وہ تمہاری ہٹ دھرمی سے مری ہے''۔

''ہاں، میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ آپ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ یہاں کون ہے جو مجھے پھانسی چڑھائے گا''۔

ابا جان نے کہا۔''ارے او کانگریسی غنڈے! یہ پاکستان ہے۔ یہاں تیری دھونس نہیں چلے گی۔ شریفوں کی طرح رہنا چاہتا ہے تو یہاں کسی کونے میں جگہ مل جائے گی۔ ورنہ جوتے مار کر گھر سے نکال دوں گا''۔

بھائی جان نے کہا۔''یہ جوتے کھا کر بھی نہیں جائے گا۔ جانتا ہے کہ آپ کے ریٹائر ہوتے ہی ریلوے پراویڈنٹ فنڈ سے بہت بڑی رقم ملے گی۔ حصے داری کے لیے کانگریس پارٹی چھوڑ کر مسلم لیگی بننے چلا آیا ہے''۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی رقم پر۔ میں صرف اماں بی، ماموں اور ممانی سے ملنے آیا ہوں۔ آپ خوش ہو جائیں، میں جا رہا ہوں''۔

میں نے زلیخا کو لینا چاہا۔ ممانی جان اسے سینے سے لگائے دور چلی گئیں۔ ماموں جان نے کہا۔''تم کہیں نہیں جاؤ گے، ہمارے ساتھ رہو گے''۔

''آپ سب میرے بزرگ ہیں۔ اس لیے ایک بار سلام کرنے آیا ہوں۔ شبو کے بعد میں صرف زلیخا کے لیے زندہ ہوں۔ مجھے کسی اور رشتے کی محبت اور ہمدردی نہیں چاہیے''۔

ممانی نے کہا۔''تمہیں نہ سہی، اس معصوم بچی کو تو ہماری ضرورت ہے۔ علی امام! تمہاری ضد نے شبو کو جدا کر دیا۔ تم نے میری گود خالی کر دی۔ اس کی کچھ تو تلافی کرو۔ ننھی شبو کو میری گود میں رہنے دو''۔

وہ درست کہہ رہی تھیں۔ انہیں ابھی بیٹی کی موت کی اطلاع ملی تھی اور ننھی شبو ان کی گود میں آئی تھی۔ میں اسے نانی سے چھین کر ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بیگ سے دودھ، فیڈر اور بچی کا ضروری سامان نکال کر ایک میز پر رکھتے ہوئے کہا۔''آپ کا زلیخا پر پورا حق ہے۔ یہ آپ کے پاس رہے گی۔ میں اپنا دوسرا ٹھکانا بنا لوں گا''۔

اماں بی نے میرے بازو کو پکڑ کر کہا۔''تم دوسری جگہ کیوں رہو گے؟ کیا میں مر گئی ہوں؟''

''اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر دے۔ جب تک ابا جان کی ریٹائرمنٹ کی تمام رقم بھائی جان ہضم نہیں کر لیں گے، میں نہیں آؤں گا''۔

بھائی جان کی ساس یعنی ہماری پھوپی اماں نے کہا۔''ارے کیوں اکڑ دکھاتا ہے۔ یہ نئی جگہ ہے۔ کوئی تجھے ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کھلائے گا۔ ایسے برے وقت میں ہم ہی کام آئیں گے''۔

میں بیگ میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈیاں نکال نکال کر میز پر رکھنے لگا۔ ان دنوں کے پچاس ہزار روپے آج کے پانچ لاکھ روپے سے زیادہ قیمت رکھتے تھے۔ ہمارے خاندان میں سبھی ریلوے ملازمین تھے۔ انہوں نے یکمشت اتنی رقم کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ابا جان ریٹائر ہوتے تو انہیں پندرہ ہزار روپے سے زیادہ نہ ملتے۔ انہوں ے حیران سے پوچھا۔''تجھے اتنی دولت کہاں سے

مل گئی؟''

''میں نے چوری کی ہے۔ ڈاکا ڈالا ہے۔ ایک کے بعد ایک قتل کیے ہیں۔ تب یہ دولت ملی ہے۔ کسی کو اعتراض ہے؟''

بھائی جان نے ایک دم سے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم تم سے بڑے ہیں امام! اگر غصے سے کچھ کہہ دیتے ہیں تو اس میں بھی پیار چھپا ہوتا ہے۔ خون کے رشتے آپس میں کتنا ہی جھگڑلیں، پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ پانی میں لاٹھی مارنے سے کیا پانی الگ ہو جاتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''لاٹھی سر پر مارنے سے خون الگ ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے سمجھا رہے ہیں۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ فرمانبردار بیٹا ہونے کا ڈھونگ رچا کر ابا جان کو بڑھاپے میں دھوکا نہ دیں''۔

میں نوٹوں کی تمام گڈیاں بیگ میں رکھ کر جانے لگا۔ ممانی نے میری قمیض پکڑلی پھر کہا۔ ''تم نے ہماری بیٹی لی ہے۔ اس کے بدلے ایک ننھی بچی دے کر نجات حاصل نہیں کر سکو گے''۔

''ممانی جان! میں آپ سے اور زلیخا سے ملنے آیا کروں گا''۔

''نہیں۔ تم ہمارے اور زلیخا کے ساتھ رہو گے۔ ورنہ میں اپنی بیٹی تم سے واپس لوں گی''۔

یہ ایسی بات تھی کہ مجھے ان کے فیصلے کے سامنے جھکنا پڑا۔ ماموں جان اچھرہ میں رہتے تھے۔ ان دنوں اچھرہ کی آبادی آج کی طرح گنجان نہیں تھی اور نہ ہی زمین اور مکانات مہنگے تھے۔ ماموں جان نے لب سڑک ایک بڑا سا مکان خرید لیا تھا۔ جس کی اوپری منزل پر رہائش تھی اور نچلے حصے پر ایک جنرل اسٹور کھول رکھا تھا۔

میں نے ان کے ساتھ رہ کر کاروبار کی طرف دھیان دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب سرحدیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سرحد پار سے پان چھالیا اور بیڑی کا تمبا کو لا کر ہول سیل مارکیٹ میں فروخت کرنے لگا۔ سندھ کے لوگ بیڑی پینے کے عادی تھے۔ کھوکھرا پار سے آنے والا تمباکو کراچی اور حیدر آباد وغیرہ میں کھپ جاتا تھا۔ سندھ کے دوسرے شہروں سے کاروباری لوگ قصور اور لاہور سے پان چھالیا اور تمباکو خرید کر لے جاتے تھے۔ یہ ایسا منافع بخش کاروبار تھا کہ سرحدوں پر پابندیاں عائد ہونے تک میں نے تقریباً تیس ہزار روپے منافع کے طور پر حاصل کر لیے پھر ماموں کی دکان میں زیادہ سے زیادہ مال رکھ کر ان کے کاروبار کو سنبھالنے لگا۔

● ● ●

دل پھولوں کی بستی

خواتین کی مقبول مصنفہ **نگہت عبداللہ** کا انتہائی خوبصورت اور طویل ناول، **دل پھولوں کی بستی**، جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے، جلد کتاب گھر پر آ رہا ہے۔ اسے کتاب گھر پر **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

چھ برس گزر گئے۔ زلیخا سات برس کی ہوگئی تھی۔ اس عرصہ میں پہلے ممانی کا انتقال ہوا۔ پھر ماموں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اماں بی نے کہا۔ ''اتنی بڑی دکان سنبھال رہے ہو، لیکن سات برس کی بچی اتنا بڑا گھر نہیں سنبھال سکے گی۔ اب یہ دادا دادی کے ساتھ رہے گی''۔

میں نے کہا۔ ''دادا دادی یہاں آ کر رہیں گے۔ ابا جان ریٹائر ہو گئے۔ ان کی جمع پونجی پندرہ ہزار روپے تھی۔ بھائی جان محلے میں پان سگریٹ کی دکان کھول کر بیٹھ گئے۔ بیوی بچوں اور پھوپی جان کو لے کر الگ گھر بسا لیا۔ کیا میں بیٹا نہیں ہوں۔ آپ میرے پاس نہیں رہ سکتیں''۔

دراصل ابا جان بڑے بیٹے پر بھروسا کر کے شرمندہ سے تھے۔ میرے پاس آ کر نہیں رہنا چاہتا تھے۔ میں خود انہیں سمجھا منا کر لے آیا۔ یوں میرا گھر بزرگوں سے پھر آباد ہو گیا اور میں گھر کے معاملات سے بالکل بے فکر ہو گیا۔

دکان میں چند ایسے گاہک آتے تھے جو میری سنجیدگی کے باوجود بڑی زندہ دلی سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ چونکہ ان سے ہزاروں لاکھوں کا لین دین رہتا تھا۔ اس لیے میں ان کی بے تکلفی کو برداشت کر لیتا تھا۔ ملک خیر الدین تو کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھے۔ اکثر پوچھتے تھے۔

''بھئی، آپ کیسے مرد ہیں۔ تنہا بیڈ روم میں ڈر نہیں لگتا؟''

''کیا اپنے ہی کمرے کی تنہائی میں ڈر لگتا ہے؟''

''عورت نہ ہو تو تنہائی کچا چبانے لگتی ہے''۔

''ملک صاحب! جہلم میں آپ کے بیوی بچے ہیں''۔

''جہلم میں۔ لاہور میں تو کنوارا نہیں رہ سکتا''۔

''کیا دوسری شادی کا ارادہ ہے؟''۔

''گھر کے دروازے پر راوی بہتا ہو تو گلی کے نلکے سے پانی لانے کوئی احمق ہی جائے گا۔ میں تو ہر چار چھ مہینے میں کام کرنے والی کی چھٹی کر دیتا ہوں۔ کسی نئی کام کرنے والی کو رکھ لیتا ہوں۔ امام بھائی! اپنے والدین پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ کسی اوپری کام کرنے والی کو رکھ لیں''۔

میں نے ان کی بے تکلفی سے بچنے کے لیے جھوٹ کہا۔ ''میرا ایک ملازم ہے''۔

''جب ایک تنخواہ سے دو کام لے سکتے ہو تو ملازمہ رکھ لو۔ یہ کام کرنے والیاں بڑے کام آتی ہیں''۔

وہ اپنی باتوں سے مزے لے کر ہنسنے لگے۔ ایسے وقت میں انہیں کاروباری معاملات کی طرف لے آتا تھا۔ ایک دن ملک خیر الدین آئے تو بڑے سنجیدہ سے تھے۔ مزاج کے خلاف مسلسل کاروباری باتیں کرتے رہے۔ میں اندر سے کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ کوئی شخص اپنی عادت کے مطابق گفتگو نہ کرے تو تشویش ہوتی ہے۔ تعجب بھی ہوتا ہے۔ وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے پوچھا۔ ''آج کچھ جلدی میں ہیں؟''

''ہاں، جہلم سے بیوی اور بیٹی آئی ہے''۔

''اور آپ اداس ہیں۔ اچھا سمجھا، گھر والوں کی موجودگی میں کوئی کام والی نہیں آئے گی''۔

''یہ بات نہیں ہے امام بھائی! میں بیوی بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں لیکن اتنے عرصے بعد بیٹی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں''۔

''خیریت تو ہے؟''

''میں سنا کرتا تھا مگر سمجھا نہیں تھا کہ بیٹیاں دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جاتی ہیں۔ میری بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہے''۔

یہ کہتے وقت ملک صاحب کا سر جھک گیا۔ یہ انسان کا سر بھی خوب ہے، پرائی جوانیوں کو فتح کر کے فخر سے اٹھتا ہے۔ اپنی بیٹی کی جوانی دیکھ کر جھک جاتا ہے۔ یہ آدمی کے اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ اپنی نیت کے اتار چڑھاؤ سے اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔

میں نے سمجھایا۔ ''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بیٹیاں سب کی جوان ہوتی ہیں اور سبھی شادی کی عمر کو پہنچتی ہیں''۔

''ہاں مگر ان کے رشتے کی فکر تو ہوتی ہے''۔

دراصل ملک صاحب کو رشتے کی اتنی فکر نہیں ہوگی۔ جتنی بیٹی کے جوان ہونے پر پریشانی تھی۔ اکثر لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ پڑوس کے گھر موت ہوئی ہے تو ان کے گھر بھی موت آئے گی۔ دل کہتا ہے، وہ نہیں مریں گے۔ دوسروں کو مرتے دیکھیں گے اور اپنی مرضی کی عمر تک زندہ رہیں گے۔ ایسا صرف موت کے لیے نہیں، جوانی کے لیے بھی سوچا جاتا ہے کہ پڑوس میں جو لڑکی ہے، وہ ہمارے لئے بچی سے جوان ہوئی ہے۔ دماغ پر پتھر اس وقت آ کر لگتا ہے، جب اپنی بیٹی کی عمر پوچھتی ہے۔ ''میں کس کے لیے جوان ہوئی ہوں''۔

ملک خیر الدین نے ایک دن پوچھا۔ ''امام صاحب! آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

انہوں نے پہلی بار مجھے امام بھائی نہیں کہا۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ ''میری شریکِ حیات اپنی محبت اور وفاداری کے جو نقوش میرے ذہن پر چھوڑ گئی ہے۔ اس کے بعد کوئی اور میری نظروں میں نہیں جچتی۔ میرے اندر کوئی آرزو نہیں مچلتی۔ کسی عورت سے محبت مانگنے کی خواہش نہیں ابھرتی''۔

''محبت اور وفاداری صرف ایک عورت کی ملکیت نہیں ہوتی۔ ہمارے تمہارے گھروں میں جو اتنی ساری لڑکیاں ہوتی ہیں، کیا یہ وفادار نہیں ہوتیں؟''

''آپ درست فرماتے ہیں۔ شریف خاندان کی لڑکیوں میں محبت اور وفا کی کمی نہیں ہوتی''۔

وہ سر جھکا کر نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ''آج رات کھانے پر کچھ لوگ میری بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں آ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں، اس موقع پر آپ بھی تشریف لائیں۔ ہماری طرف سے بھی کسی کو ہونا چاہیے''۔

''آپ مجھے اس قابل سمجھ رہے ہیں تو دکان بند کرنے کے بعد آپ کے گھر آ جاؤں گا''۔

وہ چلے گئے۔ وہ اپنی پچھلی غلطیوں کو سمجھ رہے تھے اس لیے مجھے ان پر پیار آ رہا تھا۔ جب انسان توبہ کرتا ہے تو وہ خدا کے حضور بھی پیارا

ہوتا ہے۔ یہ میرا فرض تھا کہ وہ سنبھل رہے ہیں تو میں انہیں سنبھالتا رہوں۔

میں یہی جذبات لے کر رات کے آٹھ بجے ان کے گھر پہنچا۔ انہوں نے اور ان کی بیگم نے بڑی محبت سے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میں نے پوچھا۔ ''مہمان نہیں آئے؟''

''آتے ہی ہوں گے۔ تم بتاؤ، ٹھنڈا پیو گے یا گرم؟''

انہوں نے مجھے، آپ کے بجائے تم کہا تھا۔ میں نے ذرا تعجب سے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔ ''میں بڑا احمق ہوں۔ اتنے دنوں تک خود کو جوان اور تمہارا ہم عمر سمجھتا رہا۔ جبکہ تم میرے بیٹے جیسے ہو''۔

پھر انہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''دراصل میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ آنکھوں کے سامنے بیٹا جوان ہوتا تو مجھے بڑھاپے کا احساس ہوتا۔ شباہت کے سوا میرا کوئی نہیں ہے''۔

میں نے پوچھا۔ ''شباہت؟''

''میری بیٹی کا نام شباہت ہے۔ ہم اسے شبو کہتے ہیں''۔

مجھے بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اندر سے بیگم نے ملک صاحب کو آواز دی۔ وہ ابھی آتا ہوں، کہتے ہوئے چلے گئے۔ میں نے دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے ملک صاحب کی خوش ذوقی کا پتا چلتا تھا۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ دولت اتنی تھی کہ رشتوں کی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے آباؤ اجداد کے شہر کو چھوڑ کر یہاں اس کا رشتہ کرنے والے تھے۔

ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ اس کے ہاتھوں میں شربت کی ٹرے تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ رخساروں پر حیا کی لالی تھی۔ اسے دیکھ کر پنجاب کی خوبصورتی کا یقین ہو رہا تھا۔ اس نے سلام کرتے ہوئے سینٹر ٹیبل پر ٹرے رکھ دی۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا نام شبو ہے؟''

''جی ہاں، پورا نام شباہت ہے۔ امی ابا پیار سے شبو کہتے ہیں''۔

اس نے شربت کا گلاس بڑھایا۔ میں نے گلاس لے کر پوچھا۔ ''تعلیم حاصل کر رہی ہو؟''

''نہیں، بی اے کے بعد موقع نہیں ملا''۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ''۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی اداسی تھی۔ لہجہ ایسا تھا کہ جیسے اندر سے ٹوٹی ہوئی ہو۔ ایسے میں اس کا حسن اور غضب ڈھا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''خدانخواستہ کیا بیمار رہتی ہو؟''

''جی نہیں، آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟''

''تمہاری اداسی اور سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھے میری شبو یاد آ رہی ہے''۔

اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''وہ میری شریکِ حیات تھی''۔

میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے یاد آیا۔ پھندے سے لٹکنے کے بعد اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ آنکھیں سوچتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''میں پیدا کیوں ہوئی؟ کیا بھیم سین سے عزت لٹانے کے لیے؟''

میں نے گھبرا کر سامنے بیٹھے ہوئی شبو سے نظریں پھیر لیں۔ اوہ خدایا! مجھے آنکھوں کو پڑھنا آ گیا تھا۔ اس سامنے والی کی آنکھیں بھی ایسے ہی سوالات کر رہی تھیں جن کا جواب مرد کی دنیا میں نہیں تھا۔

وہ بولی۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میری آنکھیں دیکھ کر آپ کو شریکِ حیات کی آنکھیں یاد آ گئیں، کیا وہ بیمار تھیں؟''

''وہ زخمی تھی۔ اس کی موت نہیں آئی تھی۔ پھر بھی وہ مر گئی''۔

''تعجب ہے''۔

''تعجب کی بات نہیں ہے۔ شرم والیاں ایسے ہی مرتی ہیں۔ اس کی زندگی میں ایک شیطان آیا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ مجھے منہ دکھانے سے پہلے ہی گلے میں پھندا ڈال کر مر گئی''۔

''آں ...... ایں ...... ایں'' شباہت عرف شبو کے حلق سے بڑے کرب کے ساتھ آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ دانت کچکچا رہی تھی۔ مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔ اس کے دیدے پھیل رہے تھے۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی اجنبی حملہ کرنے آ گیا ہو۔

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟''

وہ تھرتھرا رہی تھی۔ غصہ اور جنون سے لرز رہی تھی۔ پھر بیٹھے ہی بیٹھے صوفے سے فرش پر گر پڑی اس کا لعاب دہن باچھوں سے رال کی طرح بہہ رہا تھا۔ پھر اس نے اچانک ہی ایک چیخ ماری۔ میں ملک صاحب کو پکارنے ہی والا تھا۔ اس کی چیخ سن کر وہ اپنی بیگم کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے۔ ماں اسے سینے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ ''میری جند! میری جان، میں صدقے، میں واری۔ دیکھ بیٹی غصہ نہیں کرتے۔ دماغ سے نکال دے۔ اپنے اندر سے ساری باتیں نکال دے۔ نہیں تو ماں مر جائے گی''۔

ماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور بیٹی کو سمجھاتی جا رہی تھی۔ میں نے ملک صاحب سے کہا۔ ''آپ صاحب زادی کو سنبھالیں۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں''۔

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''تم بیٹھو۔ ابھی یہ نارمل ہو جائے گی۔ میں ابھی آتا ہوں''۔

انہوں نے بیگم کے ساتھ بیٹی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ پھر اسے ڈرائنگ روم سے باہر لے گئے۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ شباہت عرف شبو کا حسین مکھڑا اور اس کی ہذیانی کیفیت آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اتنی حسین لڑکی کو ایسی حالت میں دیکھ کر دل دکھ رہا تھا۔

ملک صاحب نے آ کر کہا۔ ''شرمندہ ہوں۔ اچانک ایسی بات ہو گئی''۔

''اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟ اچھا ہوا کہ لڑکے والے نہیں آئے۔ ان کے سامنے ایسا دورہ پڑتا تو......''

وہ میری بات کاٹ کر بولے۔ ''لڑکے والے نہیں آئیں گے۔ ان کا ملازم ایک پرچی لے کر آیا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ چند مجبوریوں کے باعث لڑکی دیکھنے نہیں آئیں گے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ بات شروع ہونے سے پہلے ختم ہو چکی ہے''۔

''مجھے افسوس ہے''۔

''امام! مجھے بتاؤ، میری بیٹی میں کیا کمی ہے؟''

''کوئی کمی نہیں ہے۔ ماشاءاللہ اچھی صورت ہے۔ تعلیم بھی ہے لیکن یہ دورہ کیوں پڑتا ہے؟''

''اسے ہسٹریا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر اس کی ایک ہی دوا تجویز کرتے ہیں اور وہ ہے شادی''۔

''شبو میں کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ کی دولت میں بھی کشش ہے۔ آپ کی برادری سے درجنوں رشتے آسکتے ہیں''۔

''مگر نہیں آئیں گے۔ کیا میں برادری کے لڑکوں سے ہاتھ جوڑ کر بولوں یا برادری کے باہر...... باہر......''

انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ میرے حلق میں جیسے آواز اٹک گئی۔ میں کچھ بول نہ سکا۔ بہت کچھ سمجھنے کے باوجود منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ ایک تو حیرانی کی بات یہ تھی کہ انہوں نے لڑکی دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ دوسرے یہ کہ لڑکی ہمہ صفات کی حامل ہونے کے باوجود بیاہی نہیں جا رہی تھی۔ تیسرے یہ کہ اپنی شبو کے بعد میں نے آج تک دوسری شادی کے لیے سوچا تک نہیں تھا۔ ایسے وقت میں جواباً کیا کہہ سکتا تھا۔

شباہت کا چہرہ میری نگاہوں میں کھل رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا، وہ بہترین شریکِ حیات ثابت ہو گی لیکن ساری عمر کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ منٹوں میں نہیں ہوتا۔ بیگم نے آکر کہا۔ ''اسے نیند آگئی ہے مگر ہم کب تک اسے مسکن دوائیں کھلاتے رہیں گے۔ ایسے تو وہ مر جائے گی۔ ہماری اتنی دولت کس کے لیے ہے؟ ہم کیوں زندہ ہیں؟''

وہ رونے لگیں، میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھیں۔ آنسوؤں سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ آپ کی صاحب زادی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے لیکن مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دیں''۔

ان دونوں نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میں سر سے پہاڑ اتار رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ ''اجازت دیں، پھر آؤں گا''۔

بیگم نے کہا۔ ''میں نے خاص طور پر تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے۔ تم کھانا ہمارے ساتھ کھا کر جاؤ گے''۔

''پلیز! مجبور نہ کریں۔ شبو کی حالت دیکھ کر دل پر بوجھ سا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کچھ کھایا نہیں جائے گا''۔

انہوں نے ضد نہیں کی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے خود کو شباہت کی طرف مائل کرنے لگا، یوں لگ رہا تھا جیسے اپنی بچھڑی شبو کو پھر سے بلا رہا ہوں۔ شباہت عرف شبو بہت اچھی تھی بلکہ بہت ہی اچھی تھی۔ بس دوسری شادی کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے کی دیر تھی۔

میں رات کو دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ اسے ہسٹریا نہیں ہے کوئی اور ہسٹری ہے اور ہسٹری اتنی سنگین ہے کہ

اس نے دولت مندوالدین کو بارود کے ڈھیر پر بٹھا دیا ہے۔ بارود کا ڈھیر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے اندر دھماکے ہونے لگے تھے۔

بات الجھی ہوئی تھی اور میں شادی کا سلجھا ہوا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا، دوسرے دن ملک صاحب سے کھل کر بات کروں گا۔ بھئی! صاف صاف بتائیں، آپ اپنی قوم اور خاندان کے لوگوں کو چھوڑ کر سینکڑوں میل دور آ کر بیٹی کو کیوں بیاہنا چاہتے ہیں؟

ملک صاحب ماضی کی ایک کمزوری کے باوجود بہت اچھے انسان تھے۔ کاروبار میں ان کی طرف سے کبھی دھوکا نہیں ہوا لیکن گھر کی عزت رکھنے کے لیے ایک شریف آدمی بھی تھوڑا سا جھوٹ بولتا ہے۔ تھوڑا سا دھوکا دیتا ہے۔ جھوٹ دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے لیکن جان مال اور عزت بچانے کے لیے بہترین پردہ بھی ہے۔

● ● ●

میں دوسرے دن دکان میں ملک صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے پڑوسی نے آ کر اطلاع دی، وہ اپنی بیٹی کو ہسپتال لے گئے ہیں۔ میں دکان پر ابا جان کو بٹھا کر ہسپتال پہنچا۔ وہاں ملک صاحب کی بیگم رو رہی تھیں۔ ملک صاحب انہیں تسلی دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''خیریت؟''

''پچھلی رات شبو نے خواب آور گولیاں کھالی تھیں۔ ہم فوراً اسے یہاں لائے تھے میں بیگم کو سمجھا رہا ہوں، وہ خطرے سے باہر ہے مگر یہ روئے جا رہی ہیں''۔

''میں اس کی بدنصیبی پر رو رہی ہوں کہ ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ وہ کب تک تھوڑا تھوڑا کر کے مرتی رہے گی؟''

''وہ مرنا چاہتی ہے مگر زندگی دینے والا خدا ہے۔ خدا پر یقین رکھو۔ وہ اسے مسرتوں بھری زندگی دے گا۔ بیٹی کے پاس جاؤ، اس سے زندگی سے پیار کرنے کی باتیں کرو''۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بیٹی کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ میں نے سوچا تھا، ملک صاحب سے بہت کچھ پوچھوں گا لیکن پوچھنا گویا زخموں کو کریدنا ہوتا۔ ملک صاحب بہت بے چین تھے۔ کبھی ٹہلنے لگتے، کبھی میرے پاس آ کر بیٹھ جاتے پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتے تھے۔ کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے مگر کبھی کبھی بے اختیار کہنے لگتے تھے۔ ''میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کی ہنستی بولتی زندگی چاہتا ہوں۔ وہ نہیں رہے گی تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟''

تھوڑی دیر بعد بیگم نے آ کر مجھ سے کہا۔ ''امام! وہ تم سے ملنا چاہتی ہے''۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے سامنے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں سر جھکا کر ان کے درمیان سے گزرا اور...... کچھ سوچتا ہوا اس کے کمرے کے پاس آیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی۔ جواب کا انتظار نہیں کیا۔ دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ اجلے سفید بستر پر اجلا لباس پہنے لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بیماری مسکراہٹ ابھری۔ میں قریب جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ کمزوری آواز میں بولی۔ ''معافی چاہتی ہوں، میں نے آپ کو غلط سمجھا تھا۔ آپ اپنی شریکِ حیات پر ہونے والے ظلم کی روداد سنا

رہے تھے۔ میری سمجھ میں آیا کہ مجھ پر کیچڑ اچھال رہے ہیں''۔

''اوہ!'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔''اسی لیے تم پر غصہ اور جنون طاری ہو گیا تھا؟''

''آپ کہیں گے غصہ آگ ہے۔ جنون، دیوانگی ہے۔ سب ہی نصیحتیں کرتے ہیں، آپ بھی کریں گے''۔

''نہیں، میں علاج کروں گا''۔

''علاج میں جلدی نہ کریں۔ آپ نے مرض کو کچھ تھوڑا سمجھا ہو گا۔ بہت کچھ سمجھنے کے لیے رہ گیا ہو گا''۔

''درست کہتی ہو۔ میں کل سے تمہارے بارے میں بہت الجھا ہوا ہوں''۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے۔ شام کو ہسپتال سے چھٹی ہو جائے گی۔ آپ مجھ سے ملنے گھر آئیں گے؟ صرف ایک بار''۔

''ضرور آؤں گا''۔

اس نے اطمینان کی گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں وہاں سے اٹھ کر ملک صاحب کے پاس آیا اور کہا۔''میں شام کو سات بجے شباہت سے ملنے آؤں گا اور رات کا کھانا بھی کھاؤں گا''۔

بیگم اور ملک صاحب نے خوش ہو کر احسان مندی سے مجھے دیکھا۔ میں ان سے رخصت ہو کر دکان کی طرف آتے ہوئے فیصلہ کر چکا تھا۔ میں اپنی شبو کے حوالے سے شباہت کے المیے کو سمجھ چکا تھا۔ میں دکان میں آیا تو ابا جان نے پوچھا۔''کہاں چلے گئے تھے؟''

میں نے ان کے پاس بیٹھ کر کہا۔''آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں؟''

''ہاں بیٹے بولو''۔

''ہماری زلیخا تیرہ برس کی ہونے والی ہے۔ اگر......اب میں شادی کرنا چاہوں تو......''

ابا جان نے خوش ہو کر کہا۔''ہم کب سے کہہ رہے ہیں اور تم اب اجازت مانگ رہے ہو۔ تمہاری ماں سنے گی تو خوشی سے پھولی نہیں سمائے گی۔ میں ابھی جا کر اسے خوشخبری سناتا ہوں''۔

وہ اٹھ کر جانے لگے پھر رک کر بولے۔''لڑکی کون ہے؟ اس کے والدین کہاں رہتے ہیں؟ کچھ تو معلوم ہو؟''

''یہ کل بتاؤں گا بلکہ کل آپ سب کو لے کر جاؤں گا''۔

وہ چلے گئے۔ پندرہ منٹ کے بعد ہی اماں بی سیڑھیوں سے اتر کر دکان میں آگئیں۔ میری بلائیں لے کر بولیں۔''شاد رہو، آباد رہو۔ میں کل تک انتظار نہیں کروں گی، آج ہی بہو کو دیکھوں گی''۔

''میں آپ کی مسرتوں کو اور بے چینیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر آج ان کی طرف سے ہاں ہونے دیں۔ ان کی مکمل رضامندی کے بغیر آپ کا جانا مناسب نہیں ہو گا''۔

''یہ بتاؤ، اچھی طرح پرکھ لیا ہے؟ وہ ہماری زلیخا کے لیے روایتی سوتیلی ماں تو نہیں بنے گی؟''

''اول تو وہ ایسی نہیں ہے۔ دوم یہ کہ میں شادی سے پہلے زلیخا کے نام پر ایک مکان خریدوں گا اور ابا جان کے بینک اکاؤنٹ میں اس کے نام سے دو لاکھ روپے جمع کروں گا۔ پھر ہر ماہ اسے مخصوص رقم دیتا رہوں گا۔ اس کے مستقبل کے لیے اور شادی کے لیے آپ کو فکر نہیں کرنی پڑے گی''۔

میری ان باتوں سے اماں بی اور ابا جان مطمئن ہو گئے۔ میں شام سات بجے وعدے کے مطابق ملک صاحب کی کوٹھی میں آیا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ شباہت کی امی نے کہا۔ ''وہ اپنے کمرے میں ہے۔ میرے ساتھ آؤ''۔

میں ان کے ساتھ وہاں پہنچا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی امی وہاں سے چلی گئیں۔ اس نے کہا۔ ''میں آپ کو یہاں نہیں، اس میز کے پاس بیٹھنے کو کہوں گی۔ وہاں میری ایک ڈائری رکھی ہوئی ہے۔ میری گزارش ہے کہ آپ اسے پڑھیں۔ پڑھتے وقت آپ کی پشت میری طرف رہے گی۔ جب وہ ڈائری آپ پر گراں گزرے تو آپ اسی طرح میری طرف پشت کئے یہاں سے جا سکیں گے''۔

میں نے میز پر رکھی ہوئی ڈائری کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''میں نے پڑھ کر سمجھا تو کیا سمجھا؟ پڑھنے سے پہلے کہہ دوں، تم میرے دل و دماغ کی دنیا میں آباد ہو چکی ہو''۔

یہ کہہ کر میں میز کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سرخ رنگ کی ڈائری کہہ رہی تھی کہ شباہت کے لہو میں بھیگی ہوئی ہے، وہ ڈائری اسی طرح بند رہے گی تو قلم کے ذریعے لہو نچوڑنے والی مر جائے گی۔ میں اسے بند رکھنے نہیں آیا تھا۔ اسے کھول کر پڑھنے لگا تو جیسے زخم کا منہ کھل گیا۔

پاکستان میں پہلی بار بی ڈی سسٹم قائم کیا گیا تھا۔ تمام شہروں اور چھوٹے بڑے علاقوں میں بی ڈی ممبر اور علاقائی چیئرمین کے عہدے کے لیے الیکشن ہو رہے تھے۔ شباہت کے ماموں چیئرمین شپ کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ وہ پانچوں وقت کے نمازی اور صاف گو انسان تھے۔ حکومت نے نمائندگی کرنے والے تمام چیئرمین اور بی ڈی ممبران کے لیے لاکھوں کروڑوں کی رقم دینے کا اعلان کیا تھا۔ تاکہ وہ اپنے اپنے علاقے میں ترقیاتی کام جاری رکھ سکیں۔

جہاں لاکھوں کروڑوں کی آمد ہو، وہاں بے ایمان اور موقع پرست پوری تیاریوں سے لڑنے آتے ہیں۔ ان کی پہلی تیاری میں ووٹوں کی خریداری کے لیے دولت ہوتی ہے اور آخری تیاری میں غنڈوں کی فوج آتی ہے۔

اس علاقے میں گامے نام کا بدمعاش تھا۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے مگر اس سے ڈرتے تھے۔ سامنے سے گزرتے وقت اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ وہ شباہت کے ماموں مکرم علی شاہ کے مقابلے پر کھڑا ہوا تھا۔

گاما ووٹ دینے والے ایسے افراد کو خرید رہا تھا جن کے ذریعے وہ مختلف خاندانوں اور برادریوں کے تمام ووٹ حاصل کر سکتا تھا۔ وہ کسی کے گھر مہینے کا راشن پہنچا رہا تھا۔ کسی کی بیٹی کی شادی کے لیے چار چھ ہزار روپے نقد دے رہا تھا۔ کسی کو زمین کا قبضہ دلا رہا تھا۔ کسی کی رکی ہوئی پنشن جاری کرا رہا تھا۔ کسی کو ملازمت سے لگوا رہا تھا۔ ایسے بڑے بڑے نیک کام وہ محض غنڈا گردی کے بل بوتے پر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کرنے کے لیے اس نے پولیس کو خریدا تھا اور پولیس ہمیشہ اس پارٹی کا ساتھ دیتی ہے، جس سے دہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی پارٹی سے نقد

رقم ملتی ہے اور سرکار سے ملازمت میں ترقی ملتی ہے۔ سرکار اس لیے ترقی دیتی ہے کہ غنڈاراج کی روایت برقرار رہے۔

گاما الیکشن میں جیتنے کے لیے سرکاری ذرائع استعمال کر رہا تھا۔ دولت پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ اپنے مخالف مکرم علی شاہ کو ہراساں کرنے کے لیے غنڈوں سے کام لے رہا تھا لیکن مکرم علی شاہ کی شرافت اور دینداری سے تمام لوگ متاثر تھے۔ انہیں پیر کا درجہ دیتے تھے۔ ایسے میں گامے کو اندیشہ تھا کہ وہ بازی لے جائیں گے۔

گامے نے انہیں کہلا بھیجا۔ ''شاہ جی! مجھ سے مقابلہ نہ کریں، بیٹھ جائیں۔ اس سلسلے میں آپ کے جو اخراجات ہوئے ہیں، میں ان سے دگنی رقم ادا کروں گا''۔

مکرم علی شاہ نے جواب دیا۔ ''مجھے رقم کی لالچ نہ دو۔ میں عاقبت کا دولت مند ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ گے تو قوم کا بھلا کرو گے۔ ورنہ تمہاری بدنصیبی تمہیں بٹھا دے گی''۔

شاہ جی نے جس دن گامے کی پیشکش کو ٹھکرایا۔ اسی رات ان کے ایک زبردست حمایتی کو قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے چشم دید گواہ موجود تھے لیکن گامے کے خوف سے کسی نے زبان نہیں کھولی۔ گامے نے پھر پیغام بھیجا۔ ''شاہ جی! آنکھیں کھولو''۔

پھر اس نے شاہ جی کے خاص حمایتیوں کو جھوٹے کیس میں حوالات میں پہنچا دیا۔ وہاں ڈنڈوں سے ان کی پٹائی کرائی۔ خوف و ہراس پھیلاتا رہا کہ شاہ جی کی حمایت کرنے والے پولیس کے ڈنڈے کھاتے رہیں گے۔ پولیس والوں سے نجات پا کر آئیں گے تو غنڈے ان کی پٹائی کریں گے۔ گامے نے پھر کہلا بھیجا۔ ''شاہ جی! آنکھیں کھولو......''

الیکشن کا دن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، علاقے میں سنسنی اور دہشت بڑھتی جا رہی تھی۔ گامے کو اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی شاہ جی کی ثابت قدمی کے باعث اپنی ناکامی کا اندیشہ تھا۔ اس نے شاہ جی کو آخری دھمکی دی۔ ''شاہ جی! آخری وارننگ ہے، آنکھیں کھولو......''

شباہت عرف شبو کو سب لوگ مکرم علی شاہ کی بیٹی کہتے تھے حالانکہ سب ہی ماموں بھانجی کا رشتہ جانتے تھے۔ انہوں نے شبو کو بچپن سے گود میں کھلایا تھا۔ وہ جوان ہوئی تو تینوں وقت اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے اسے پوچھتے تھے۔ یہ سب ہی کہتے تھے کہ شبو اپنے ماموں کی جان ہے۔

گامے نے ان کی جان نکال لی۔ شبو کو اغوا کر کے ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے اس کی چیخیں بھی ماموں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ماموں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پولیس والے صرف رسمی کارروائی کریں گے۔ انہوں نے قانونی کارروائی کا آغاز کیا۔ گامے کا وکیل پہلے سے اس کی ضمانت کے کاغذات حاصل کر چکا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔ ''شاہ جی! گھر کی عزت کا خیال کریں۔ گامے کی بات مان لیں''۔

شاہ جی نے کہا۔ ''تم قانون کے محافظ ہو کر ایسا کہہ رہے ہو۔ تمہاری باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ تم میری بھانجی کو اغوا کرانے والوں کا ساتھ دے رہے ہو۔ یہ یقین دلا رہے ہو کہ میں الیکشن میں بیٹھ جاؤں گا تو گھر کی عزت واپس آ جائے گی''۔

شاہ جی تھانے سے گھر پہنچے تو بہت پریشان تھے۔ بہن کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''بھائی جان! الیکشن کو جہنم میں ڈالیں۔ جس گھر کی عزت جا رہی ہو، اس گھر کا مالک ملک اور قوم کی کیا عزت رکھے گا؟ ہم نے پاکستان غنڈوں کے لیے بنایا ہے، ہم انہیں اقتدار سونپ کر ہی اپنے گھر کی عزت رکھ سکتے ہیں''۔

شاہ جی اندر سے ٹوٹ رہے تھے۔ شیطان کو شکست دینے کے ارادے کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اسی وقت ان کے حجرے میں ایک بڑا سا پیکٹ آ کر گرا۔ انہوں نے اسے اٹھا کر کھولا۔ اندر سے شباہت کی ایسی شرم ناک تصویریں نکلیں جن پر ایک نظر پڑتے ہی وہ ایک دم سے چیخ پڑے۔ دوڑتے ہوئے حجرے سے باہر آئے۔ اسی حالت میں چیختے چلاتے...... بولنے لگے۔ ''لوگو! شیطان جیت گیا۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ میں الیکشن میں امیدوار نہیں ہوں۔ میں ٹوٹ چکا ہوں، میں مر چکا ہوں......''

وہ چیختے ہوئے دوڑتے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنوں نے سوالات کیے۔ ''شاہ جی! کیا ہو گیا ہے؟ کہاں جا رہے ہیں؟ رک جائیں......''

جس نے بھی انہیں روکنے کی کوشش کی وہ اسے دھکے دے کر آگے ہی آگے بھاگتے رہے۔ لوگ اتنا تو سمجھ گئے کہ بھانجی کے اغوا کے باعث ان کا دماغ چل گیا ہے۔ ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ ان کے بھاگنے میں ایسا جنون تھا جیسے وہ عقل کے ساتھ بینائی سے بھی محروم ہو گئے ہوں۔ وہ کئی جگہ اوندھے منہ گرے پھر اٹھے پھر گرے۔ آخر دوڑتے دوڑتے گامے کے دروازے پر آ کر گر پڑے۔ ہانپتے ہانپتے رونے لگے۔

''مجھے میری بچی دے دو۔ میں کمبخت ہوں۔ عزت کو داؤ پر لگا کر قوم کا مسیحا بننا چاہتا تھا۔ مجھے میری بچی دے دو۔ میری بچی دے دو...... دے دو...... دے دو......''

وہ گامے کی چوکھٹ پر سر پٹخ رہے تھے اور ''دے دو...... دے دو'' کی گردان کرتے جا رہے تھے۔ گامے نے آ کر ان کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر کہا۔ ''شاہ جی! میں آپ کا خادم ہوں۔ حکم کریں، یہ بھیڑ اپنے ساتھ کیوں لائے ہیں؟''

انہوں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''میرے آگے پیچھے بھیڑ نہیں ہے۔ میں اکیلا تھا، اکیلا ہوں۔ دیکھو، میں مسلمان ہو کر تمہارے سامنے جھک گیا۔ اپنے ایمان سے گیا۔ اب تو میری بچی مجھے واپس دے دو''۔

''میں نہیں جانتا، وہ کہاں ہے مگر وعدہ کرتا ہوں۔ آج شام سے پہلے اسے تمہارے پاس پہنچا دوں گا''۔

اس نے انکار بھی کیا کہ وہ اغوا کا ذمے دار نہیں ہے اور اقرار بھی کیا کہ اغوا شدہ کو گھر پہنچا دے گا۔ مغرب کی نماز کے بعد محلے میں شور اٹھا کہ شبو آ گئی ہے۔ ماں اور ماموں دوڑتے ہوئے گھر سے باہر آئے۔ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کتنے ہی لوگ ایک ریڑھے کو دھکیلتے ہوئے لا رہے تھے۔ اس ریڑھے پر شبو ایک لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کا تمام لباس پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ دو افراد وہ ریڑھا لے کر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بیان دیا۔ ''اس نے نہر میں چھلانگ لگائی تھی۔ ڈوب کر مرنا چاہتی تھی۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے بچایا ہے''۔

وہ محض بیان بازی تھی، ڈرامہ بازی تھی۔ اسے گھر میں لایا گیا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس کے اندر بے آبروئی کا جو صدمہ گھر کر گیا تھا۔ اس کا

علاج ڈاکٹر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد بستر سے اٹھنا اور کہیں جا کر مرنا چاہتی تھی۔ روکنے پر چیخنے اور تڑپنے لگی تھی۔ ''چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو، مجھے مرجانے دو۔ میں زندہ نہیں رہوں گی، مجھے مرجانے دو......''

ماں نے سمجھایا۔ ماموں نے دینی درس دیا۔ ''خودکشی حرام ہے۔ گناہ ہے، آج تم جس عذاب میں ہو، مرنے کے بعد اس سے زیادہ عذاب ملے گا۔ حالات سے لڑنے اور زندہ رہنے کا حق حاصل کرنے کے لیے دین اسلام میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے''۔

اصل بات دنیا والوں کو منہ دکھانے کی تھی۔ ماں محلے پڑوس کی عورتوں سے نظریں چرا کر باتیں کرتی تھی۔ ماموں نے حجرے سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اگر چہ کوئی ان کے منہ پر کچھ پوچھتا نہیں تھا۔ وہ بات پوچھنے کی نہیں تھی، سمجھ لینے کی تھی۔

جو ملاقات کے لیے آتے تھے، وہ محبت اور ہمدردی سے کہتے تھے۔ ''آپ پریشان نہ ہوں، کوئی بدنام نہیں کرے گا۔ ہم بدنام کرنے والوں کا منہ توڑ دیں گے''۔

گویا وہ ہمدردی کی آڑ میں کہتے تھے۔ ''تم بدنام ہو مگر ہم بدنامی کو زبان تک آنے نہیں دیں گے''۔

شبو ایک بار ماں کے ساتھ ایک تقریب میں گئی تو سبھی عورتیں محبت سے پیش آئیں لیکن ماؤں نے اشاروں سے کنواری بیٹیوں کو شبو سے دور رہنے کی تاکید کی۔ اس رات تقریب سے واپس آ کر شبو نے پھر خودکشی کی کوشش کی، جسے ماں اور ماموں نے ناکام بنا دیا۔ ماں نے اس کے قدموں پر سر پٹخ پٹخ کر کہا۔ ''تجھے ماں سے ذرا بھی محبت ہے تو میری قسم کھا کر وعدہ کر، کبھی جان دینے کی حماقت نہیں کرے گی''۔

وہ بولی۔ ''آپ مجھے بے حیائی سے زندگی گزارنے کی قسم دے رہی ہیں؟''

ماموں نے کہا۔ ''عزت سے جینے کی ایک ہی صورت ہے۔ اپنے باپ کے پاس چلی جاؤ۔ لاہور بندہ پرور شہر ہے۔ وہاں نئے لوگ اور نیا ماحول ہوگا۔ کوئی تمہاری روداد نہیں جانتا ہوگا۔ وہاں تم نئے سرے سے زندگی گزار سکو گی''۔

ان حالات میں وہ ماں کے ساتھ لاہور آ گئی تھی۔ میں میز کے پاس اس کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ اس کی ڈائری پڑھ چکا تھا۔ اسے اپنا فیصلہ پہلے ہی سنا چکا تھا۔ اب فیصلے پر تصدیقی مہر لگانی تھی۔

میز پر ایک شمع اور ایک ماچس رکھی ہوئی تھی۔ میں نے تیلی جلائی اور ڈائری کو آگ لگا دی۔ شعلہ بھڑکا تو شباہت نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

میں ڈائری کے ایک سرے کو چٹکی سے پکڑ کر آگ کے شعلے میں سے اسے دیکھ کر بولا۔ ''میں تمہارا ماضی جلا رہا ہوں۔ ہماری دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہ رہے، جو خودکشی کے لیے بھڑکاتی ہو اور زندگی سے پیار نہ کرنا سکھاتی ہو''۔

آگ نے پوری طرح ڈائری کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ ننگے فرش پر جلنے لگی۔ دھواں چھوڑتے ہوئے راکھ ہونے لگی۔

وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میرے فیصلے سے اس کے چہرے پر اطمینان اور آسودگی پیدا ہوگئی تھی۔

آنکھیں پیار سے بولنے لگی تھیں۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ یاد آیا کہ برسوں کے بعد ایک گلاب کو چھو رہا ہوں، اور یاد آیا کہ عورت کا ہاتھ اس کے حسن وسراپا کا تعارف پیش کرتا ہے کہ اس میں کتنی ملائمت، کتنی نزاکت، کتنی حرارت اور کتنی جذباتی شرارت ہوتی ہے کہ چھوتے ہی دل دھڑکتا ہے اور کسی کا دھڑکا نہیں رہتا۔ اپنی، اپنی ہی ہوتی ہے، ممنوعہ نہیں ہوتی۔

میں نے کہا۔ ''شبو! تمہارا ہاتھ تھام کر کہہ رہا ہوں، یہ ہوس نہیں ہے۔ آدابِ محبت ہے۔ آدمی کے اندر شیطان ہوتا ہے لیکن شیطان کو کبھی میرے اندر آنے کا راستہ نہیں ملا۔ آج سے ہماری نئی زندگی کی ابتدا ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں، شادی سے پہلے ہم روز ایک بار ملتے رہیں اور ایک دوسرے کا بھرپور اعتماد حاصل کرتے رہیں''۔

''یہ اچھی بات ہے۔ آپ گھر آیا کریں، میں آپ کے ساتھ باہر جایا کروں گی اور خود کو یقین دلاتی رہوں گی کہ میری دنیا بدل رہی ہے۔ کوئی مرض لاعلاج نہیں ہوتا۔ کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی مسیحا آ ہی جاتا ہے''۔

● ● ●

وہ بستر سے اتر کر میرے ساتھ کمرے سے باہر آئی۔ اس کے والدین بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شبو خوشی سے کھلی ہوئی تھی۔ دونوں بانہیں پھیلا کر دوڑتی ہوئی جا ماں سے لپٹ گئی۔ اس کی خوشیاں دیکھ کر ملک صاحب نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

''علی امام! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں تمہاری انسانیت اور شرافت کا جتنا بھی قصیدہ پڑھوں، کم ہوگا''۔

''آپ کا اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔ ہم اپنے بہترین اعمال سے ہی ایک دوسرے کو جیت سکتے ہیں۔ آپ کی اجازت ہو تو کل شام کو میں اپنے والدین کے ساتھ آؤں گا''۔

ان کی بیگم نے کہا۔ ''صد بسم اللہ بیٹے! آج تم نے عید کا چاند دکھایا ہے۔ کل ہماری عید ہوگی''۔

''شبو کی ماں! عید میں منہ میٹھا کیا جاتا ہے اور تم سوکھے منہ چاند رات کی باتیں کر رہی ہو''۔

وہ سب ہنسنے لگے۔ بیگم نے کہا۔ ''ابھی منہ میٹھا کراؤں گی تو رات کا کھانا رہ جائے گا۔ پہلے کھانا پھر سویٹ ڈش......

وہاں ہم سب کے کھلے ہوئے چہرے کہہ رہے تھے کہ خزاں رسیدہ ماحول میں بھی اچانک بہار آ جاتی ہے۔ کھانے کی میز پر شباہت میرے ساتھ بیٹھی تھی اور مختلف ڈشیں بڑھا بڑھا کر دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اتنا کھلاؤ کہ کل بھی کھانے کے لیے پیٹ میں جگہ رہے۔ ورنہ کل یہاں اماں بی اور ابا جان پوچھیں گے کہ میں نے شادی کی خوشی میں خوراک کیوں کم کر دی ہے؟''

اس بات پر سب ہی ہنسنے لگے۔ شباہت شرما کر دوپٹے سے چہرہ چھپا کر کھانے لگی۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اور شباہت نے چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ملک صاحب مجھے اپنی کار میں گھر کے سامنے چھوڑ گئے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے نئے سرے سے جواں عمری کی رومان پرور زندگی شروع کر رہا ہوں۔

واقعی شبو کے بعد پہلی بار شباہت نے ایسا ہی جادو کیا تھا۔ بہت عرصے بعد بستر پر کروٹیں بدلنے والی رات آئی تھی۔ میں نے اماں بی

اور ابا جان کو خوشخبری سنادی تھی۔ وہ دوسری شام کو بہو دیکھنے کے خیال سے خوش ہو رہے تھے۔ زلیخا بھی نئی امی کو دیکھنے کے لیے مچل رہی تھی۔

خوشیاں مقدر بن جائیں تو غموں کی آنچ جلدی نہیں آتی۔ دوسری شام ہم سب وہاں پہنچے۔ ملک صاحب اور ان کی بیگم نے بڑی گرم جوشی سے میرے والدین کا استقبال کیا۔ شباہت ٹھنڈا مشروب لے کر آئی۔ اماں بی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''ماشاء اللہ، ہماری بیٹی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ آج بیٹی کہہ رہی ہوں، جلدی بہو بھی کہوں گی''۔

شباہت نے شرماتے ہوئے مشروب کی ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھی۔ پھر زلیخا کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ابا جان نے کہا۔ ''ہم بار بار امام سے کہتے رہتے تھے، بھئی شادی کرلو۔ ہمیں اس بڑھاپے میں پھر ایک بار بہو کا منہ دکھا دو مگر یہ ہمیں...... برسوں سے ٹال رہا تھا۔ آج پتا چلا کہ ہمارے لیے بہو کی صورت میں ہیرا تلاش کر چکا ہے''۔

اماں بی نے کہا۔ ''کسی رسمی بات چیت کے بغیر ہم آپ کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہے ہیں''۔

بیگم نے کہا۔ ''بیٹی آپ کی ہے۔ آپ نکاح کی تاریخ طے کریں اور لے جائیں''۔

ابا جان نے کہا۔ ''تاریخ طے کرنے سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ ہم آپ کی بیٹی کے جہیز میں چار جوڑے کپڑے، ایک جائے نماز اور ایک قرآن مجید لیں گے۔ اس سے زیادہ کچھ دینا چاہیں گے تو ہم قبول نہیں کریں گے''۔

''ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ ہم تمام دولت جائیداد اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے؟''

''ہمارے بیٹے کے پاس بھی وہ سب کچھ ہے، جو آپ دینا چاہیں گے۔ آپ اس بات سے پریشان ہوں گے کہ آپ کی دولت اور جائیداد کا کیا بنے گا؟''

میں نے کہا۔ ''ابا جان، چاہتے ہیں۔ آپ ایک بڑا اور جامع فلاحی ادارہ قائم کریں۔ جو دولت بیٹی کو دینا چاہتے ہیں، اسے قوم کی بے سہارا بیٹیوں اور بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کریں''۔

''سبحان اللہ! آپ باپ بیٹے تعمیری جذبات کے حامل ہیں۔ میں آپ کے تعمیری جذبات کو ضرور عملی جامہ پہناؤں گا''۔

ابا جان نے کہا۔ ''اگلے ماہ کی دس تاریخ کو عید ہے۔ عید کے آٹھویں دن ایک جمعہ ہے۔ نکاح کے لیے جمعہ کا دن کیسا رہے گا؟''

''بہت مبارک رہے گا۔ جب آپ سادگی سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو سادگی سے نکاح کرنے میں نہ زیادہ انتظامات کی ضرورت ہو گی اور نہ زیادہ دن لگیں گے''۔

اماں بی نے مٹھائی پیش کی۔ اپنے ہاتھ سے شباہت کی امی کو مٹھائی کھلائی۔ پھر سب ہی ایک دوسرے کو کھلانے لگے۔ یوں بات طے ہو جانے پر میں نے شباہت کو اور اپنے دل کے قریب محسوس کیا۔ وہ میری بننے سے پہلے میری جان سے زیادہ عزیز بن رہی تھی۔ اس رات کے بعد ہمیں اتنی آزادی مل گئی کہ میں روزانہ شام سے پہلے شباہت کے گھر جانے لگا۔ پھر ہم باہر تفریح کے لیے نکل جاتے تھے۔ وہ ایسے امن و امان سے مطمئن رہنے کے دن تھے کہ عوام پر ناقابلِ برداشت مہنگائی کا بوجھ اور بے روزگاری کا زیادہ چرچا نہیں تھا۔ ان دنوں بھی مجرم، قاتل، چور

بدمعاش اور اسمگلر تھے لیکن وہ اتنے محدود تھے کہ پوری قوم پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی ہے کہ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں پولیس والوں کا قبلہ بڑی حد تک درست تھا۔

ابتدا میں جو سب سے بڑا تاریخی سانحہ ہوا، وہ قائد ملت لیاقت علی خان کی شہادت تھی۔ کراچی سے خیبر تک پوری قوم چیخ اٹھی۔ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے یقین دلایا گیا کہ ان کے قتل کے پیچھے جو سیاسی سازش ہے، اسے بے نقاب کیا جائے گا لیکن آنے والے حکام یقین دلاتے رہے اور سازش پر دبیز پردے ڈالتے رہے۔

حکمرانوں کے لیے یہ پہلا سیاسی تجربہ تھا کہ عوام کے سامنے اسلام اور پاکستان کے نام پر جذباتی تقریریں کرتے رہو۔ ایسی تقریریں ماں کی لوری کی طرح قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا کریں گی۔ نصف صدی کے اختتام نے ثابت کر دیا ہے کہ قوم ان ہی باتوں میں کھیلتی رہی تو پچاس برس تو کیا، سو برس تک بھی سوتی رہے گی۔ جب اصحاب کہف کی طرح آنکھیں کھولے گی تو زمانہ بدل چکا ہوگا۔ نہ ملک رہے گا، نہ اپنی تہذیب کی بو باس رہے گی۔ کوئی ہمیں شناخت کرنے والا بھی نہیں رہے گا۔

میری آپ بیتی میں رومانس بھی ہے۔ خوش گوار ازدواجی لمحات بھی ہیں اور اولاد کی خوشیاں بھی ہیں لیکن یہ سب ایسے ہی آنے جانے ہیں جیسے شبو کے ساتھ گزارے ہوئے دن آنی جانی ہو گئے۔ میں شباہت کو شریکِ حیات بنا کر اپنے گھر والوں اور کاروباری معاملات میں مصروف ہو گیا۔ میرا خیال ہے، پوری قوم اپنے اپنے معاملے میں مصروف رہی ہوگی۔ اسی لیے ہم ہر بدلتے ہوئے دن اور بدلتے ہوئے سماجی اور سیاسی حالات کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہے۔

ایک چھوٹی سی بات یہ ہوئی کہ میں شباہت کے ساتھ جناح گارڈن (لارنس گارڈن) میں سیر کر رہا تھا۔ تین جوانوں نے شباہت کو چھیڑنا شروع کیا۔ ہم پریشان ہو کر چند لوگوں کے قریب آگئے۔ میں نے ایک شخص سے کہا۔ ''جناب! یہ جوان مجھے تنہا پا کر میری شریکِ حیات کو چھیڑ رہے ہیں''۔

تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور...... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ...... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے...... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے تساؤ کے آدم خور...... جنھوں نے یوگنڈا میں بچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم ''Ghost & The Darkness'' بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرسن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب (The Man-Eaters of Tsavo) کا اُردو ترجمہ بہت جلد **کتاب گھر** پر پیش کیا جائے گا۔

ان لوگوں نے ان تینوں کو گھور کر دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر ان کی پٹائی کرنے لگے۔ وہ تینوں بھی جواباً لڑنے لگے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بات اتنی بڑھے اور میری شباہت تماشا بن جائے۔ میں انہیں روکنے لگا۔ اس کوشش میں مار بھی کھانے لگا۔ پھر پولیس والے آگئے۔ انہوں نے ایک نوجوان کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ پھر ایک نے کہا۔ ''کیا تمہیں پتا نہیں ہے کہ یہ ایس ایچ او صاحب کے صاحب زادے ہیں۔ کیا حوالات میں جانا چاہتے ہو؟''

ایس ایچ او کے حوالے سے ہماری حمایت کرنے والے پیچھے ہٹ گئے۔ اس جوان نے مجھ سے کہا۔ ''اب کیا اپنے باپ کو بلاؤ گے؟''

میں نے سپاہیوں سے کہا۔ ''دیکھو، یہ کیسی نازیبا باتیں کر رہا ہے؟''

ہماری حمایت کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ ''باؤ جی! عورت کو ساتھ لے کر گھومتے ہو تو برداشت کی عادت بھی ڈالو''۔

دوسرے نے کہا۔ ''یہ لاہور ہے، زندہ دل جوانوں نے ذرا موج مستی کی ہے۔ تمہاری عورت کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''زندہ دلانِ لاہور کو تہمت نہ دیں۔ یہاں کے باشعور لوگ تخریبی انداز میں زندہ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ اتنی جلدی نظریں بدل رہے ہیں''۔

ایک سپاہی نے کہا۔ ''یہ جھگڑا مکا رہے ہیں۔ تھانے چلنے کا شوق ہے تو چلو۔ ہمارے صاحب تمہاری شرافت کی دھلائی کر کے رکھ دیں گے''۔

شباہت نے میرا بازو تھام کر کہا۔ ''آپ ان کے منہ نہ لگیں، یہاں سے چلیں''۔

وہ مجھے کھینچتی ہوئی دور لے آئی۔ تینوں جوان اور پولیس والے ہنس رہے تھے۔ پہلی بار ایسی ناانصافی پر میرا دل بھاری ہوا اور پولیس والوں کے رعب و دبدبے کا پتا چلا۔ لوگوں کی طوطا چشمی سے معلوم ہوا کہ شریف عورتوں اور مردوں کو راہ چلتے بھائیوں سے اخلاقی مدد کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔

دوسرے دن تک میں نے اس ناگوار واقعے کو اپنے اندر کچل ڈالا۔ برسوں پہلے سے ہندوؤں کی نازیبا اور ناجائز باتیں سہنے کی عادت تھی۔ شاید اسی عادت نے مجھے بہلا دیا تھا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ دو چار ایسے ہیں تو کیا ہوا؟ سب ہی ایسے نہیں ہیں۔

غلط کو صحیح کہنے اور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سچ کو باطل بنا کر بدل دینے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ یوں بھی اپنی ذاتی زندگی کی ذمے داریاں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ گھر سے باہر بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔ شادی کے تیسرے برس شباہت نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ میرے اندر کی رہی سہی ناگواری ختم ہوگئی۔ میں نے بیٹے کو بازوؤں میں لے کر چوما۔ پھر شباہت سے پوچھا۔ ''بیٹے کا نام کیا رکھا جائے؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''علامہ اقبال کے نام پر اقبال رکھا جائے۔ پورا نام اقبال امام......''

میرے والدین اور شباہت کے والدین بہت خوش تھے۔ ملک صاحب میرے ابا جان کے ساتھ تمام دن رہتے تھے۔ ان بزرگوں

نے ایک بہت بڑا پلاٹ خریدا تھا۔ پلاٹ کے ایک بڑے حصے میں یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کے لیے ہاسٹل، اسکول اور تربیت گاہ تعمیر کرا رہے تھے۔ اس کے بعد پلاٹ کے دوسرے حصے میں یتیم اور بے سہارا لڑکوں کے لیے بھی یہ سلسلہ شروع کرنے والے تھے۔

زندگی امن وامان سے اور سکون سے گزرتی رہے۔ اللہ تعالیٰ روزی میں برکت دیتا ہے تو نیک اور تعمیری کام کرتے رہنے سے قلبی سکون حاصل ہوتا رہتا ہے۔ گرلز اسکول اور ہاسٹل کی تکمیل ہوتے ہی ہمارے بزرگوں نے بوائز اسکول اور ہاسٹل کی عمارت کی تعمیر شروع کرادی۔ ہم کروڑ پتی نہیں تھے لیکن ان دنوں اینٹیں، سیمنٹ، بجری اور دیگر تعمیراتی سامان اتنا سستا تھا کہ صرف چند لاکھ روپوں سے فلاحی ادارے قائم کئے جاسکتے تھے۔ میرے بڑے بیٹے کی پیدائش کے تین برس بعد شباہت نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ ہم نے قائداعظم کے حوالے سے اس کا نام محمد علی رکھا۔ ان تین برسوں میں دونوں اسکول اور ہاسٹل تیار ہو گئے۔ پھر ٹھوس اور مکمل انتظامات کے ساتھ تعلیمی سلسلہ جاری ہو گیا۔

ایک اچھے شخص سے برے اعمال نادانستگی میں ہوتے ہیں لیکن ہر گزرنے والا دن بتا رہا تھا کہ دانستہ حالات برے کئے جا رہے ہیں۔ جاگیردار اپنے جاگیردارانہ نظام کی بقا کے لیے پاکستان کے روزِ اول سے سیاست میں قدم جماتے آ رہے تھے۔ اب ان کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ آنے والے دنوں میں اسمبلیوں کی ایک ایک سیٹ ان کی ہونے والی تھی اور قومی خزانے کا ایک ایک پیسہ ان کے تصرف میں آنے والا تھا۔ فی الحال آثار بتا رہے تھے کہ جس طرح کسانوں کو صدیوں سے ناخواندہ رکھ کر صرف اپنے کھیتوں کی مزدوری ان کا مقدر بنا دیا گیا تھا، اسی طرح شہروں میں بھی برائے نام محدود سرکاری اسکول اسی طرح قائم کئے جا رہے تھے کہ چار چھ ماہ بعد ایسے اسکولوں کی انتظامیہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اساتذہ کئی کئی ماہ کی تنخواہ وصول کرنے کی بھاگ دوڑ میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح وہ بچوں کی تعلیم پر توجہ دینے کے قابل نہیں رہتے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر قوم کو تعلیم سے محروم رکھنے کی سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔

مجھے قومی سطح کی اس کمزوری کا پتا اس وقت چلا جب میرا بیٹا اقبال امام دوسری جماعت میں پڑھنے کے باوجود پچاس تک صحیح ترتیب کے ساتھ گنتی نہ لکھ سکا۔ میں نے اس سے دو حرفی اور سہ حرفی الفاظ کے ہجے کر کے پڑھنے کو کہا تو وہ طوطے کی طرح رٹے ہوئے سبق کو پڑھتا رہا لیکن اسی لفظ کے صحیح ہجے نہ کر سکا۔ تعلیم کی بنیاد اتنی کمزور تھی کہ میں نے پریشانی میں اس وقت صرف اپنے بچے کے بارے میں سوچا، قوم کے بچوں کا مستقبل بعد میں سجھائی دیا۔

ہم نے جو گرلز اور بوائز اسکول قائم کیا تھا، وہاں ٹھوس بنیادوں پر بڑی ذمے داریوں کو سمجھتے ہوئے تعلیم دی جاتی تھی۔ وہ دونوں اسکول یتیم اور بے سہارا لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے تھے۔ ہم اپنے بنائے ہوئے اصولوں اور قواعد کے خلاف اپنے بیٹے کو وہاں داخل نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے اقبال امام کو سرکاری اسکول سے نکال لیا۔ پرائیویٹ اسکول کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ رئیس زادوں کو او لیول کی بہت مہنگی تعلیم دی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ رئیس زادے بہ آسانی غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

او لیول کی تعلیم سے اوپر کا درجہ اے لیول کا تھا۔ ایسے پرائیویٹ اسکولوں میں انگلینڈ اور امریکہ کے لیول کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتی تھیں لیکن انگلش میڈیم سے تعلیم دی جاتی تھی۔ تیسرے نچلے درجے کے پرائیویٹ اسکولوں میں انگلش میڈیم سے تعلیم دینے کا دعویٰ کیا جاتا تھا

لیکن وہاں کے اساتذہ ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے کمپاؤڈرز حضرات کلینک میں دواؤں کا مکسچر بناتے بناتے ڈاکٹر یعنی نیم حکیم بن جاتے ہیں۔ نیم ڈاکٹروں کی دوائیں امراض دور نہیں کرتیں، صرف مریضوں کو دلاسا دیتی ہیں۔ نیم اساتذہ کی تعلیم پوری قوم کو بصیرت نہیں دیتی، صرف ظاہری بصارت دے کر مطمئن کرتی رہتی ہے کہ انہوں نے کتابیں پڑھ لی ہیں، ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں۔

میں نے اقبال امام کو اے لیول کے ایک اسکول میں داخل کرایا۔ اس کے لیے ٹیوشن پڑھنے کا انتظام کیا تاکہ اس کی تعلیمی بنیاد مضبوط ہو سکے۔ میں بیٹے کو خود پڑھانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ 1965ء کی جنگ کے بعد ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت متواتر بگڑتی جا رہی تھی۔ اب اپنی سفید پوشی اور سابقہ سماجی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے زیادہ کمانے کی خاطر زیادہ سے زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ پہلے مہنگائی رینگ کر آتی تھی۔ اب ہر نئے سال بجٹ کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ پر آنے لگی۔ ملک کے ہر شہر اور ہر شعبۂ زندگی کے لوگ احتجاج کرنے لگے اور رفتہ رفتہ مہنگائی مسلط کرنے والوں کے مظالم کو یوں بھولنے لگے جیسے حاجی حضرات شیطان کو کنکریاں مار کر واپسی میں اس کی شیطانیت کو بھول جاتے ہیں۔

یہ کوئی پیچیدہ فلسفہ نہیں ہے۔ سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ عوام کو مہنگائی اور بے روزگاری کی دلدل سے نکلنے نہ دو۔ وہ خود کو اور اپنے کنبے کو دلدل سے نکالنے کے مسئلے میں دھنسے رہیں گے۔ اسی ایک طریقہ کار پر برسوں سے عمل کیا جا رہا ہے۔ بصیرت کی کمی یہ شعور نہیں دیتی کہ ہر آنے والی حکومت مہنگائی اور بے روزگاری کی دودھاری تلوار کو تیز سے تیز تر کیوں کرتی رہتی ہے؟

یہ دودھاری تلوار میرے سر پر بھی لٹک رہی تھی۔ دکانداری برائے نام سہارے کے طور پر رہ گئی تھی۔ گرلز اور بوائز اسکول اور ہاسٹل فلاحی ادارے تھے۔ وہاں یتیم اور بے سہارا طلباء طالبات سے فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ہاسٹل میں ان کے کھانوں، کپڑوں اور رہائشی اخراجات کا بوجھ تھا۔ اب اتنا بڑا بوجھ ہم سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ 1970ء تک میرے والد، والدہ اور شباہت کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ملک صاحب تنہا اس فلاحی ادارے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انہوں نے اس ادارے کو ایک نیک اور عبادت گزار شخص کے حوالے کر دیا۔ حالات نے اتنا مجبور کیا تھا کہ وہ ادارے کو اس شخص کے نام لکھ کر فلاحی کاموں سے محروم ہو گئے تھے۔

زلیخا بائیس برس کی ہو گئی تھی۔ سیاسیات میں ایم اے کرنے والی تھی اور ایک بڑے اخبار سے بھی منسلک تھی۔ خود کماتی تھی اور اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کی شادی ہو جائے لیکن اسے سیاست کا اور صحافت کا چسکا پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنے ملک کے زیادہ شہروں کو نہیں دیکھا ہے۔ لاہور کی لڑکیوں کو سمجھتا ہوں۔ یہ اسکول اور کالجوں میں پہنچ کر لڑکوں کی طرح بے باک ہو جاتی ہیں۔ زلیخا کو بھی خود پر اتنا اعتماد تھا کہ ہم نے اسے شادی کے سلسلے میں زیادہ مجبور نہیں کیا۔ اسے اپنے طور پر مستقبل سنوارنے کی اجازت دے دی۔

ایک دن میں نے اور شباہت نے دونوں بیٹوں کے ساتھ پکنک کا پروگرام بنایا۔ زلیخا سے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن وہ اپنے اخبار کے لیے ایک بہت بڑے سیاسی جلسے کی کوریج کے سلسلے میں مصروف تھی۔ ہم پکنک کے لیے راوی کے کنارے آئے۔ ہمارے پاس ایک کیمرا تھا۔ ہم نے پکنک اسپاٹ پر پہنچنے تک کئی تصویریں اتار دیں۔ راوی کنارے پہنچے تو دریا میں ایک بادبانی کشتی پل کے نیچے سے گزرتی آ رہی تھی۔ شباہت

نے کہا۔ ''پل سے نیچے گزرنے والی کشتی کا منظر کتنا اچھا لگ رہا ہے''۔

میں نے پیچھے جا کر کہا۔ ''دونوں بیٹوں کے ساتھ ادھر دیکھو۔ میں ایک دو تین کہوں گا، پلکیں نہ جھپکانا، ریڈی ون ٹو تھری......'' میں نے تصویر کھینچ لی۔ شباہت نے بھی مجھے اسی جگہ کھڑا رہنے کو کہا۔ بادبانی کشتی بڑی سست رفتار سے آ رہی تھی۔ اس نے میری بھی تصویر اتار لی۔ ہم تصویریں اتارتے رہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر کھلی فضاؤں میں مزے سے تفریح کرتے رہے۔ اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری فوٹوگرافی ہم پر آئندہ عذاب نازل کرتی رہے گی۔

دو اجنبی شخص دور دور سے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ہمیں کسی ایسی جگہ روکنا چاہتے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو لیکن ہم پل کی طرف جا رہے تھے تاکہ رکشا یا ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس گھر جا سکیں۔ جب ہم پُر ہجوم سڑک پر پہنچے تو ان میں سے ایک شخص نے تیزی سے قریب آ کر کہا۔ ''رک جاؤ۔ تم نے ہماری تصویر کیوں اتاری ہے؟''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم آپ کی تصویر کیوں اتاریں گے؟ آپ کو شبہ ہے تو آپ نے اتارتے وقت کیوں نہیں روکا؟''

''مجھے اس وقت پتا نہ چلا۔ بعد میں میرے ساتھی نے مجھ سے کہا کہ ہماری تصویر اتاری گئی ہے''۔

''دیکھیں جناب! میں بیوی بچوں والا ہوں۔ اپنے گھر والوں کی تصویریں اتارتا رہا ہوں۔ آپ سے کوئی جان پہچان نہیں ہے۔ میں بھلا آپ لوگوں کی تصویریں کیوں اتاروں گا؟''

''تم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہوگا۔ اتفاقاً ایسا ہو چکا ہے۔ اپنے کیمرے سے وہ نیگیٹو رول نکال کر مجھے دو''۔

''میں اپنے بیوی بچوں کی تصویریں کیوں دوں؟''

اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر کہا۔ ''یہ پندرہ ہزار ہیں۔ اسے رکھو، نیگیٹو رول مجھے نہ دو لیکن ابھی اسے کیمرے سے نکال کر ضائع کر دو''۔

''آپ رقم کا لالچ نہ دیں۔ کچھ معلوم تو ہو، آپ ہمارے نیگیٹو رول کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟''

''میرے پاس کچھ بتانے یا سمجھانے کا وقت نہیں ہے۔ جو کہتا ہوں، وہ کرو''۔

''آپ پریشان نظر آتے ہیں۔ ایسا کریں، اپنا پتا بتائیں۔ اگر ہمارے ساتھ اتفاقاً آپ کی تصویر آ گئی ہوگی تو ہم وہ نیگیٹو آپ کو دے دیں گے''۔

اس نے غصے سے دیکھا۔ پھر تیور بدل کر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسی وقت ایک وین آ کر رکی۔ وین پر اس اخبار کا نام لکھا ہوا تھا جس میں زلیخا کالم لکھا کرتی تھی۔ اس گاڑی کو دیکھتے ہی وہ شخص تیزی سے پلٹ کر دوڑا...... لوگوں اور درختوں کے جھنڈ میں گڈمڈ ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔

زلیخا نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر آتے ہوئے کہا۔ ''میں جلسے سے واپس آرہی ہوں۔ گھر کی طرف سے گزروں گی۔ آیئے گاڑی میں گھر تک چھوڑ دوں''۔

وہ اپنی امی کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں سوار کرانے لگی۔ پھر اس نے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بٹھایا۔ میں نے دور تک دیکھا۔ وہ شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر میں بھی اس وین میں بیٹھ گیا...... شباہت نے کہا۔ ''عجیب آدمی تھا، نہ جان نہ پہچان، خواہ مخواہ ہماری تصویریں مانگ رہا تھا''۔

زلیخا نے پوچھا۔ ''امی! کس کی بات کر رہی ہیں؟''

شباہت نے کہا۔ ''پتا نہیں کون تھا؟ کہہ رہا تھا کہ اس کی تصویر ہمارے ساتھ اتر گئی ہے۔ لہٰذا ہم اپنا پورا نیگیٹو رول ضائع کر دیں''۔

زلیخا نے سوچتی ہوئی نظروں سے پہلے شباہت کو پھر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''وہ شخص کون تھا؟ مجھے یاد آرہا ہے، جب میں نے یہ گاڑی آپ کے پاس رکوائی تو ایک آدمی پلٹ کر جا رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ یہ بات سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی ایک تصویر کے باعث پوری فلم ضائع کرنے کو کیوں کہہ رہا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''اس کے بدلے ہمیں پندرہ ہزار روپے کی پیش کش کر رہا ہے''۔

میری اس بات سے دوسرے دو صحافی اور اخباری فوٹو گرافر چونک گئے۔ ایک نے کہا۔ ''او گاڈ! زلیخا وہ کوئی پُراسرار بندہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کوئی اس کی تصویر دیکھے''۔

دوسرے صحافی نے کہا۔ ''پندرہ ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ اتنی بڑی رشوت کوئی بڑی بات چھپانے کے لیے ہی ہو سکتی ہے''۔

زلیخا نے ایک صحافی سے کہا۔ ''گلزار صاحب! ہمیں ابھی لیبارٹری چل کر اس فلم کے پرنٹ نکلوانا چاہئیں''۔

صحافی گلزار احمد خاں نے ڈرائیور کو لیبارٹری کی طرف جانے کی ہدایت کی۔ زلیخا نے دوسرے صحافی سے کہا۔ ''سلام! ملکی سیاست بری طرح سازشوں کے جال میں الجھ رہی ہے''۔

عبدالسلام بھٹی نے کہا۔ ''میں تو پیش گوئی کر چکا ہوں۔ یہ سات دسمبر 1970ء کو ہونے والے الیکشن کے نتائج متنازعہ ہوں گے''۔

گلزار احمد خاں نے ناگواری سے کہا۔ ''سلام! جرنلزم کی فیلڈ میں ابھی طفلِ مکتب ہو۔ ہم جیسے بزرگ صحافیوں کی طرح پیش گوئیاں نہ کیا کرو''۔

سلام بھٹی اپنے استاد صحافی کے سامنے سر جھکا کر خاموش رہا۔ وین لیبارٹری کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ وہ سب میرے اور میری فیملی کے ساتھ لیبارٹری کے شوروم میں آئے۔ گلزار احمد خاں نے مجھ سے نیگیٹو رول لیا۔ پھر وہاں کے انچارج کو اپنا پریس کارڈ دکھا کر کہا۔ ''ہم اس اخبار کے تین صحافی اور دو فوٹو گرافر ہیں۔ اس رول میں ایک تصویر نہایت اہم ہے۔ کل صبح کے اخبار میں شائع ہو گی۔ جتنی جلدی ہو سکے، اس کا پرنٹ نکلوا دیں''۔

انچارج نے سب کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر اس رول کو لے کر خود لیبارٹری والے حصے میں چلا گیا اور کچھ بعد پر تصویریں لے

آیا۔ زلیخا نے اس سے تصویریں لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابو! آپ اس شخص کو تصویر میں پہچانیں''۔

میں نے پہچان لیا۔ شباہت نے بادبانی کشتی کے ساتھ میری ایک تصویر اتاری تھی۔ میرے پیچھے کچھ فاصلے پر دو شخص بالکل واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ شباہت تصویر میں مجھے اچھی طرح فوکس نہ کر سکی تھی۔ میرے بجائے دور پتھر پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد صاف طور پر نظر آرہے تھے۔ جو شخص مجھے پندرہ ہزار روپے کی رشوت دے رہا تھا، وہ تصویر میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دوسرے شخص سے مصافحہ کرتے ہوئے گفتگو کرنے کے پوز میں تھا۔

گلزار احمد خاں جھک کر دیکھ رہا تھا...... وہ تصویر ہاتھ میں لے کر وہ حیرانی سے بولا۔ ''زلیخا...... سلام! یہ تو چودھری سراج الدین ہیں اور یہ دوسرا تو وہی ایجنٹ ہے''۔

سلام نے کہا۔ ''یس سر! چودھری صاحب کو آج کے جلسے میں ہونا چاہئے تھا لیکن یہ راوی کنارے اس ایجنٹ سے ملاقات کر رہے ہیں''۔

گلزار احمد خاں نے انچارج سے فون کرنے کی اجازت طلب کی۔ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر کہا۔ ''ہیلو سر! میں آپ کا خادم گلزار احمد خاں بول رہا ہوں۔ چودھری سراج الدین اور اس موسٹ وانٹڈ ایجنٹ کی ایک دھماکہ کرنے والی تصویر ہاتھ لگی ہے۔ میں فوجی لیبارٹری سے بول رہا ہوں''۔

اس نے خاموش ہو کر دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر کہا۔ ''سر! میں فون پر اس ایجنٹ کا اور اس کی سیکرٹ ایجنسی کا نام نہیں لے سکتا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، پورے پنجاب کی پولیس اور سی آئی اے والے اس ایجنٹ کو تلاش کر رہے ہیں''۔

وہ پھر خاموش ہو کر دوسری طرف کی باتیں سنتے ہوئے زلیخا اور سلام کو دیکھنے لگا۔ زلیخا نے پوچھا۔ ''باس کیا کہہ رہے ہیں؟''

''چودھری سراج الدین وہاں باس کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ ان سے باتیں کرنے کے لیے مجھے انتظار کرنے کو کہا ہے''۔

اس نے پانچ منٹ تک خاموش رہنے کے بعد فون پر کہا۔ ''یس سر! میں لائن پر ہوں۔ جی...... جی...... سر!...... جی...... جی ہاں......''

وہ تھوڑی دیر تک جی اور جی ہاں کرتا رہا پھر بولا۔ ''یس سر! ہو جائے گا۔ تصویر اور نیگیٹو زلیخا کے والدین کے پاس ہیں۔ زلیخا اپنی بچی ہے۔ میں ابھی اسے راضی کرلوں گا۔ جی...... جی ہاں۔ او، اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ یہ راضی ہو جائے گی، میں ابھی تصویر اور نیگیٹو لے کر آرہا ہوں''۔

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ انچارج وہاں سے اٹھ کر لیبارٹری کی طرف گیا تھا۔ گلزار احمد خاں نے کہا۔ ''زلیخا! تم بہت لکی ہو۔ ہمارے اخبار میں تمہاری جاب...... مستقل کی جا رہی ہے۔ باس نے کہا ہے۔ وہ تصویر اور نیگیٹو کسی کے ہاتھ نہ لگنے دو اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی سے ذکر کرو۔ یہ چیزیں ابھی باس کے پاس لے چلو''۔

زلیخا نے پوچھا۔ ''ایسی کیا رازداری ہے؟ چودھری سراج الدین وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، یہ تصویر شائع نہیں ہونے

دیں گے؟''

''نہ شائع ہو۔ ہمارا تو فائدہ ہے۔ میری ترقی ہوگی۔ تمہاری ملازمت مستقل ہو رہی ہے''۔

زلیخا نے کہا۔''اور چودھری صاحب پندرہ ہزار روپے کی اس گڈی کو لاکھوں روپے کی گڈی بنا کر باس کو دیں گے''۔

''بھئی اخبار والوں اور سیاست دانوں میں لین دین ہوتا رہتا ہے۔ چودھری صاحب اسلام آباد سے الیکشن جیت کر کسی نہ کسی محکمے کے وزیر بنیں گے۔ ہمارے اخبار کے لیے کاغذ کے کوٹے میں اضافہ کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سرکاری اشتہارات ہمارے اخبار کو ملا کریں گے''۔

زلیخا نے کہا۔''ہمارے اخبار کی اشاعت آسمان سے باتیں کرنے لگے گی لیکن آپ بھول رہے ہیں، میرے ابو نے پندرہ ہزار کی رشوت ٹھکرا دی اور میں ان کی بیٹی ہوں۔ یہ تصویر اور نیگیٹو آپ کو اور باس کو نہیں دوں گی''۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے کہا تھا کہ میری رہنمائی میں صحافت کے داؤ پیچ سیکھتی رہو گی۔ میں تمہارا استاد ہوں۔ کیا تم میری بات سے انکار کرو گی؟''

''استاد غلط سبق پڑھائے تو سبق کو صحیح پڑھنے کے لیے استاد کو چھوڑ دینا چاہیے''۔

گلزار احمد خاں نے مجھ سے کہا۔''بزرگو! آپ بیٹی کو سمجھائیں۔ چودھری صاحب اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کی بہت اہم شخصیت ہیں۔ اقتدار میں آنے کے بعد ہم جیسوں کو چٹکی میں مسل سکتے ہیں''۔

میں نے پریشان ہو کر بیٹی کو دیکھا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔''ابو! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے چودھری صاحب اقتدار کی کرسی پر آئیں گے تو چٹکی میں مسلیں گے۔ اس سے پہلے یہ تصویر دوسرے اخبار میں شائع ہوگی اور ابھی میں یہ تصویر لے کر سلام بھٹی کے ساتھ سی آئی اے کے دفتر جا رہی ہوں۔ آپ امی اور بچوں کو گھر لے جائیں''۔

گلزار احمد خاں ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرتے ہوئے بولا۔''زلیخا! ابھی نہ جاؤ۔ میری رہنمائی قبول نہ کرو مگر میں تمہاری بہتری کے لیے رکنے کو کہہ رہا ہوں۔ بزرگو! آپ سمجھائیں، پانی میں رہ کر مگرمچھوں سے بیر نہیں رکھنا چاہیے''۔

زلیخا، میرا اور شباہت کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ سلام نے میرے دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ہم نے وہاں سے جاتے ہوئے گلزار احمد خاں کی آواز سنی۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔''سر! زلیخا آپ کی پالیسی کے خلاف قدم اٹھا رہی ہے۔ اپنے ساتھ تصویر اور نیگیٹو لے جا رہی ہے۔ دعویٰ کر رہی ہے کہ دوسرے اخبار میں وہ تصویر شائع کرائے گی...... جی...... جی ہاں...... جی اچھا......!''

اس نے بلند آواز میں پکارا۔''زلیخا! واپس آؤ۔ باس تم سے بات کرنا چاہتے ہیں''۔

وہ ریسیور میز پر رکھ کر تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ ہم ایک ٹیکسی میں اور زلیخا ایک رکشا میں سلام کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی ہماری گاڑیاں اس سے دور ہوتی چلی گئیں۔ آگے جا کر ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ زلیخا اور سلام کسی دوسرے اخبار کے دفتر

کی طرف گئے تھے۔ہم اپنے گھر کی طرف جانے لگے۔

شباہت نے کہا۔''ہماری یہ بیٹی بیٹا ہے۔ بڑی بے باک اور دلیر ہے۔ بڑی بڑی شخصیات کی خبروں کی کوریج کرتی ہے۔ان کے خلاف لکھتی بھی ہے۔کسی سے مرعوب نہیں ہوتی۔زمانہ بدلتا جارہا ہے۔لڑکیوں کو زلیخا کی طرح ہونا چاہئے''۔

''کچھ بھی ہو، بیٹی ہے۔دل ڈرتا ہے۔میں ہندوستان سے یہاں تک دیکھتا آرہا ہوں، غنڈہ گردی کے بغیر سیاست داں ایک قدم نہیں چل سکتے۔وہ ان کا استاد کہلانے والا صحافی، کیا نام تھا اس کا...... ہاں گلزار احمد، وہ کہہ رہا تھا کہ چودھری سراج الدین سب سے بڑی سیاسی پارٹی کا بہت ہی اہم شخص ہے''۔

''ہونے دیں۔وہ زیادہ سے زیادہ فرعون بنے گا۔فرعون کے خوف سے ہم خدا کو نہیں بھول سکتے۔ہم نے اپنی جوان نسل کے حوصلے بلند نہ کئے تو سیاست میں صرف شریف بدمعاش رہ جائیں گے، جرأت مند صحافی پیدا نہیں ہوں گے''۔

● ● ●

ہم نے گھر پہنچ کر رات کا کھانا کھانے سے پہلے زلیخا کا انتظار کیا جو تصاویر ہم نے اتاری تھیں۔انہیں پھر دیکھنے لگے۔ ہمارے جیسے عام لوگوں کی زندگی میں کبھی آوٹنگ اور سیر وتفریح کے جو مختصر لمحات آتے ہیں، ان کی کچھ یادگار تصویریں ہمیں خوش کررہی تھیں۔ بادبانی کشتی کو پس منظر بنا کر پہلے میں نے شباہت کی تصویر کھینچی تھی۔پھر شباہت نے میری تصویر اتاری تھی۔بادبانی کشتی کو اپنی تصویر کے فریم میں رکھنے کی جلدی تھی۔اس جلدی میں شباہت کی طرح میں نے بھی شباہت کو اچھی طرح فوکس نہیں کیا تھا۔اس کے بجائے کچھ فاصلے پر پیچھے بیٹھے ہوئے وہ دونوں اشخاص یعنی چودھری سراج الدین اور ایک ایجنٹ واضح طور پر نظر آرہے تھے۔شباہت نے ناگواری سے کہا۔''یہ دشمن میری تصویر میں بھی آگئے ہیں''۔

میں نے کہا۔''لیبارٹری میں یہ تصویر میں نے چھپالی تھی۔میں نہیں چاہتا تھا کہ میری تصویر کے ساتھ وہ تمہاری تصویر بھی لے جائیں''۔

''آپ نے اچھا کیا ورنہ اخبار میں ان کم بختوں کے ساتھ میری تصویر بھی شائع ہونے چلی جاتی''۔

میں نے کاروباری معاملات کے لیے دکان میں ٹیلی فون رکھا تھا۔اس کا ایک اضافی کنکشن اوپری رہائشی حصے میں بھی تھا۔اس فون کی گھنٹی بجنے لگی۔میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔''ہیلو، میں علی امام بول رہا ہوں''۔

''ابو! میں ہوں زلیخا، مجھے یہاں دیر ہورہی ہے۔میں نے سوچا امی اور آپ پریشان ہوں گے اس لیے فون کیا ہے''۔

''بیٹی ہم نے تمہارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا ہے۔کب تک آرہی ہو؟''

''آپ امی سے بات کرائیں''۔

میں نے شباہت کوفون دیا۔ وہ ریسیور کان سے لگا کر بولی۔ ''بولو میری جان! کیا ہمیں بھوکا رکھو گی؟''

''امی! بڑا سنگین معاملہ ہے۔ میں گھر آ کر بتاؤں گی۔ ابو میرے لیے بہت ڈرتے ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں، سب ہی لڑکیاں کانچ جیسی نہیں ہوتیں کہ جو چاہے، انہیں چکنا چور کردے۔ پلیز، آپ انہیں کھانا کھلائیں۔ میں گیارہ بجے تک آجاؤں گی''۔

''بیٹے! اپنے ابو کی فکر نہ کرو۔ ابھی ہم کھانا کھانے بیٹھ رہے ہیں۔ تم اپنا کام نمٹا کر آؤ''۔

وہ ریسیور رکھ کر بولی۔ ''آپ زلیخا کی فکر نہ کریں۔ تندور سے روٹیاں لے آئیں۔ میں سالن گرم کرتی ہوں''۔

میں اٹھ کر نیچے آیا۔ اپنے دل کو سمجھانے لگا۔ حوصلہ رکھنا چاہتا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا لیکن بھارتی سیاست سے گزر کر شبو کی خودکشی دیکھ آیا تھا۔ مغربی پاکستان میں شباہت کے ساتھ بھی سانحہ ہوا تھا۔ ہم نے شرم کے مارے زلیخا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ماضی میں اس کی اپنی ماں کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی تھی۔ زلیخا باشعور اور بے باک صحافی تھی۔ وہ تاریخ، ماہ و سال کی گنتی کے ساتھ پاکستان کی پوری ہسٹری جانتی تھی۔ اسے اپنی فیملی کی ہسٹری سے بھی واقف رہنا چاہئے تھا لیکن اپنے ملک سے تعلق رکھنے والے خاندانی واقعات شرمناک ہوں تو جوان اولاد کے سامنے بزرگوں کی زبان نہیں کھلتی۔ اسے کس منہ سے کہا جاتا کہ اس کی ایک ماں بھارت میں لٹ گئی۔ لوٹنے والے ہندو تھے۔ دوسری ماں پاکستان میں لٹ گئی، لوٹنے والے مسلمان تھے۔

ہندوستان اور پاکستان کی تفریق سے کیا ہوتا ہے۔ بے ضمیر لوگوں کے لیے مائیں، بہنیں اور بیٹیاں دونوں ملکوں میں لوٹ کا مال ہیں۔ دونوں ملکوں کے سیاست دانوں کا پہلا اور آخری ہتھیار غنڈے ہیں۔ دونوں ملکوں کے بہت سے حکمران قومی خزانے کے ناقابلِ گرفت معزز ڈاکو ہیں۔ دونوں ملکوں کی ایک جیسی باتیں، ایک جیسی حکایتیں ہیں۔ یہ ملکِ خداداد اس لیے حاصل ہوا ہے کہ مسلمانوں کو برہمن نہ لوٹیں، مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے کیا مسلمان مر گئے ہیں؟

چنگیز خان

چنگیز کی زندگی اور فتوحات تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے پڑھے بغیر تاریخ کا سفر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کا شمار انسانی تاریخ کے عظیم فاتحین میں سے ہوتا ہے۔ گو اس کا تعلق وحشی قبائل سے تھا لیکن وہ ایک ممتاز درجے کا وحشی تھا۔ وہ صرف تلوار کی زبان ہی نہ جانتا تھا بلکہ از روئے ضرورت ٹریک ٹو ڈپلومیسی بھی بروئے کار لاتا۔ 1219 سے 1225 تک کے درمیانی عرصے میں چنگیز نے ترکستان کے راستے ایران اور افغانستان، دوسری طرف پامیر کی پہاڑی چوٹیوں سے سندھ کے کناروں تک آذربائیجان، کاکس اور جنوبی روس کے علاقے کی مہمات سر کیں...... چنگیز خان کی تاریخ آپ کتاب گھر کے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

ہم نے کھانا کھالیا۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ شباہت نے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں، آپ زلیخا کے معاملے میں ڈرتے کیوں ہیں؟ لیکن آپ کو سمجھنا چاہئے کہ ہم قصہ کہانیوں کے کردار نہیں ہیں کہ ایک ہی طرح کے واقعے یا سانحے سے دوچار ہوتے رہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ جو شبو اور میرے ساتھ ہوا، وہ زلیخا کے ساتھ بھی ہو''۔

میں نے کہا۔ ''کاتب تقدیر سے بڑا مصنف کوئی نہیں ہے۔ وہ ایک ہی بات کو ایک ہی حکایت کو کئی مسرتوں کی روشنی سے اور کئی صدمات کی روشنائی سے لکھتا ہے۔ انہیں پڑھا جائے تو وہ الگ الگ تاثرات دیتے ہیں۔ مجھے تو یہ فکر کھاتی ہے کہ پتا نہیں زلیخا کا مقدر روشنی سے لکھا گیا ہے یا روشنائی سے؟''

''راستے میں دیوار ہو تو فکر کرنے اور اپنا خون جلانے سے دیوار گر نہیں جاتی۔ سر مارنے سے سر ٹوٹتا ہے، دیوار نہیں ٹوٹتی، لاحول پڑھنے سے ماحول نہیں بدل جاتا۔ ان حالات میں حوصلہ رکھنا چاہئے اور اپنے رب العزت سے اپنوں کی عزت اور سلامتی کی دعائیں مانگتے رہنا چاہئے''۔

زلیخا آ گئی۔ میری جان میں جان آ گئی۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''امی! میں پیٹ بھر کر آئی ہوں۔ چائے بھی کئی بار پی چکی ہوں۔ آپ سب نے کھانا کھالیا ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''کھانا اطمینان سے کھایا جاتا ہے اور ہمارا اطمینان تو تم ہو۔ تمہارے بغیر ہم نے بس کھانا ہی کھایا ہے''۔

وہ میرے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''میں آپ کے اندر کی باتیں سمجھتی ہوں۔ آپ بیٹی ذات کو بہت کمزور سمجھتے ہیں۔ چلیں کمزور ہی سہی۔ جب ہم ٹوٹنے والی چیز ہیں تو ٹوٹنے سے ڈرنا کیا؟ جب انسان مرنے والی چیز ہے تو مرنے سے ڈرنا کیا؟ تدبر اور حوصلہ ہو تو خود کو ٹوٹ پھوٹ سے بچایا جا سکتا ہے''۔

''تم ماں بیٹی ایسی باتیں کرتی ہو کہ میری باتوں کا کوئی وزن ہی نہیں رہ پاتا۔ یہ بتاؤ، کیا وہ تصویر شائع کروا رہی ہو؟''

''صرف تصویر ہی نہیں، اس کے ساتھ دھما کا خیز خبر بھی لگائی جا رہی ہے۔ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹی کے سیاست داں چودھری سراج الدین اور ایک بھارتی ایجنٹ دھرم راؤ کی خفیہ ملاقاتیں......''

میں نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ تو ایک سنگین غیر ملکی سازش ہے اور ہمارے ملک کا ایک سیاست داں شریک ہے۔ بیٹی! یہ ایسے تخریبی معاملات ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں اور ملک تو بڑے ہوتے ہیں، یہ ہمارا گھر چھوٹا ہے اور ہم اتنے بڑے سیاسی کھلاڑیوں کے سامنے پیروں سے ٹھکرائی جانے والی گیند کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

''ابو گیند کو ٹھوکروں سے لے جانے والے اوندھے منہ گرتے ہیں۔ اگر مجھ جیسے صحافیوں نے انہیں نہ گرایا تو پھر ہم سب ہمیشہ ٹھوکروں میں ہی رہیں گے۔ آپ ان معاملات میں اپنے ذہن کو نہ الجھائیں۔ بہت رات ہو چکی ہے، سو جائیں''۔

شباہت نے کہا۔ ''زلیخا! تم بھی تھکی ہوئی ہو، جا کر سو جاؤ''۔

''میں بستر پر جا رہی ہوں مگر نیند نہیں آئے گی۔ پہلی بار اتنی بڑی سیاسی سازش کو ایک اخبار میں کوریج دے رہی ہوں۔ میرے لیے نئے اخبار کی ملازمت بھی ہے۔ میں نے یہاں کا پتہ اور فون نمبر لکھوا دیا ہے۔ ہر صبح ہمارے دروازے پر اخبار آ جایا کرے گا''۔

وہ ہمارے کمرے سے جانا چاہتی تھی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ رک گئی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو، میں علی امام بول رہا ہوں''۔

''میرا نام چودھری سراج الدین ہے۔ راوی کنارے ہماری ملاقت ہو چکی ہے''۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''آپ......؟ آپ میرا فون نمبر جانتے ہیں؟''

''پہلے اخبار کے دفتر کو خریدا ہے۔ پھر یہاں کا فون نمبر معلوم کیا ہے۔ تمہاری سمجھ میں آ چکا ہوگا کہ ہم نے اخبار کے مالک کے ساتھ اپنی تصویر اور نیگیٹو کو بھی خرید لیا ہے۔ کل صبح کے اخبار میں میری تصویر اور میرے خلاف کوئی خبر شائع نہیں ہو گی''۔

میں نے کن انکھیوں سے زلیخا کو دیکھا پھر کہا۔ ''جناب آپ راوی کنارے اپنا نام بتا دیتے تو بات یہاں تک نہ بڑھتی۔ آپ کی سیاسی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ میں تو آپ کا نام سنتے ہی پوری فلم ضائع کر دیتا''۔

''تم سمجھدار ہو۔ تمہاری باتوں نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ جو کرنا چاہتا تھا، وہ نہیں کروں گا مگر اپنی بیٹی کو اچھی طرح سمجھا دو، وہ اپنی چادر میں رہے، چادر سے باہر نکلے گی تو ہم اسے لباس سے باہر نکال دیں گے۔ جس کاغذ پر وہ لکھتی ہے، اس کاغذ کا ایک ٹکرا بھی اسے بدن چھپانے کو نہیں ملے گا''۔

بیٹی کی بے لباسی کی بات ایسی تھی کہ میں نے شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے ریسیور کو اتنی سختی سے جکڑ رکھا تھا جیسے بیٹی کے باپ کا گلا دبوچ کر پوچھ رہا ہوں''۔ جب بیوی کو تحفظ نہ دے سکا تو بیٹی کیوں پیدا کی؟''

شباہت نے میرے ہاتھ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ مجھ سے پوچھا۔ ''کیا چودھری سراج الدین تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔ یہ پہلے غنڈے ہوتے ہیں پھر سیاست داں بنتے ہیں۔ اس نے میری بیٹی کے لیے ایسی بات کہی ہے کہ میں شرم سے کٹ رہا ہوں، مر رہا ہوں''۔

میں نے غصے سے زلیخا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے صحافت کا نہیں، بے حیائی کا طوق گردن میں پہن رکھا ہے۔ کیوں لڑکوں جیسے کام کرتی ہو؟ شریف زادیاں گھر کی چار دیواری میں رہ کر بھی بہتیرے کام کر سکتی ہیں۔ جو کر رہی ہو، اس سے کیا مل رہا ہے؟ وہ تصویر اور وہ دھماکا خیز خبر کبھی شائع نہیں ہو گی''۔

زلیخا اس بات پر چونک گئی۔ فوراً ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ''ہیلو، میں زلیخا بول رہی ہوں۔ اخبار کے مالک حامد مرزا سے بات کراؤ''۔ وہ دوسری طرف سے جواب سننے کے بعد بولی۔ ''ان کے گھر کا نمبر بتاؤ''۔

اس نے گھر کے نمبر معلوم کیے۔ پھر اخبار کے مالک سے رابطہ کیا۔ اسے اپنا نام بتایا۔ وہ بولا۔ ''تمہارا تعلق میرے دفتر سے ہے۔

آدھی رات کو گھر کے فون پر ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے''۔

''میں آپ کو گھر پر زحمت دینے کی معافی ابھی مانگ لوں گی۔ پہلے اتنا بتا دیں، چودھری سراج الدین کی تصویر اور خبر شائع ہو رہی ہے یا نہیں؟''

اس نے ''نہیں'' کہہ کر فون بند کر دیا۔ زلیخا نے جھنجلا کر دوبارہ نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر حامد مرزا کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

وہ سخت لہجے میں بولی۔ ''میں ابھی صحافیوں اور فوٹو گرافروں کی فوج لے کر تمہاری کوٹھی میں پہنچوں گی۔ تم پوری قوم کو حقائق سے بے خبر رکھنے کا دھندا کر رہے ہو۔ میں تم سے وہ تصویر اور نیگیٹو واپس لوں گی۔ ہمارے ملک میں صرف تمہارے جیسے بکاؤ اخبار مالکان نہیں ہیں۔ وہ تصویر اور وہ خبر دوسرے نہیں، تیسرے، تیسرے نہیں چوتھے اخبار میں شائع ہو گی اور ضرور ہو گی''۔

''نہیں ہو گی۔ وہ تصویر اور نیگیٹو اس سی آئی اے کے انسپکٹر کلیم اللہ کے پاس ہے، جس کے پاس جا کر تم نے چودھری صاحب کے خلاف رپورٹ دی تھی''۔

زلیخا رابطہ ختم کر کے انسپکٹر کلیم اللہ کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم بڑے سیاست دانوں سے، بڑے اخبار والوں سے جنگ لڑ رہی ہو؟ کیا تمہیں اتنی سی عقل نہیں ہے کہ کل میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ چودھری نے میری شرافت کا لحاظ کر کے تمہیں پہلی بار معاف کیا ہے''۔

وہ جیسے سن نہیں رہی تھی۔ فون پر کہہ رہی تھی۔ ''ہیلو کلیم صاحب! میں زلیخا امام بول رہی ہوں۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ چودھری سراج الدین کے خلاف کوئی خبر اور تصویر شائع نہیں ہو گی اور وہ تصویر مع نیگیٹو آپ کی تحویل میں ہے''۔

''تحویل میں تھی مگر اسے چودھری صاحب نے لے کر جلا دیا ہے۔ تمہیں اس بات پر غصہ آ سکتا ہے۔ میں چاہوں گا، تم تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈے دماغ سے...... میری باتیں سنو۔ سات دسمبر کو جو الیکشن ہونے والا ہے، قوم کو اس کے نتائج بعد میں معلوم ہوں گے۔ ہمیں پہلے معلوم ہو جاتے ہیں۔ ہماری پیش گوئی یاد رکھو، یہاں مغربی پاکستان میں چودھری صاحب کی پارٹی کو کامیابی حاصل ہو گی۔ تم سوچو، آنے والے کل کو تم سر کا آنچل بناؤ گی، یا بے بسی کے آنسو پونچھنے والا رومال؟''

''میں نے صرف اپنے لیے نہیں، قوم کی بہتری اور وطن کے استحکام کے لیے صحافت کا پیشہ اختیار کیا ہے''۔

''لیکن ہم قانون کے محافظ حکومتِ وقت کے فرماں بردار ہوتے ہیں۔ آنے والے وقت کے حکمران کو ناراض کریں گے تو ملازمت سے ہاتھ دھونا ہو گا ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے بیوی بچوں پر بھی حکمرانوں کا عذاب نازل ہوتا رہے گا''۔

وہ بولی۔ ''سپاہی کی زندگی ہمیشہ تلوار کی دھار پر رہتی ہے۔ یہ آپ نے پہلے کیوں نہیں سوچا؟ کیا آپ کا ضمیر گوارا کر رہا ہے کہ ہمارے ملک میں مجرمانہ سیاست کی روایت قائم ہو جائے؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔ مجرم کو سزا ملے گی۔ چودھری صاحب کل صبح تک اس بھارتی ایجنٹ کو ہمارے حوالے کر دیں گے۔ اسے ہمارے ملک میں آ کر سازشیں کرنے کی عبرت ناک سزا ملے گی''۔

شباہت ریسیور سے کان لگا کر زلیخا سے ہونے والی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی بیٹی کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا۔ ''کلیم صاحب! میں زلیخا کی امی بول رہی ہوں۔ آپ میری بیٹی کو اچھی باتیں سمجھا رہے ہیں۔ ہمارے جوان بچے بدلتے ہوئے حالات کے تیور کو سمجھ نہیں پاتے ہیں۔ اپنے جوش اور جذبے میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ آپ ہماری طرف سے چودھری صاحب کو کہہ دیں، ہماری صحافی بیٹی ان کے خلاف کبھی سوچے گی بھی نہیں۔ ہم، اس کے والدین ذمے داری لیتے ہیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی، آپ ہماری بات چودھری صاحب تک پہنچا دیں''۔

''آپ اطمینان رکھیں، آپ کا دانش مندانہ فیصلہ چودھری صاحب کو سنا دیا جائے گا''۔

شباہت نے شکریہ کہہ کر فون بند کیا۔ پھر بولی۔ ''زلیخا! تم ذہین ہو۔ کیا اپنی ذہانت سے اتنا نہیں سمجھ سکتیں کہ جو لوگ اقتدار حاصل کرنے سے پہلے فون اور پریس کو خرید رہے ہیں، وہ دراصل بے حساب جرائم کا اجازت نامہ حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس اجازت نامے کی رُو سے تمہیں اغوا کرا سکتے ہیں۔ ہلاک کرا سکتے ہیں۔ ہمارے منہ پر کالک پوت سکتے ہیں''۔

وہ بولی۔ ''مجرم اور قاتل تو کسی کو بھی تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ کیا اس خوف سے مجرموں کو حکمران بنا دیا جائے؟''

''چودھری سراج الدین مجرم ہوتا تو بھارتی ایجنٹ کو قانون کے حوالے کرنے کا وعدہ نہ کرتا۔ کل صبح اسے گرفتار کیا جائے گا۔ اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ تم چودھری کے ساتھ اس ایجنٹ کی بھی تصویر شائع کرانا چاہتی تھیں۔ وہ شائع نہیں ہو رہی ہے مگر تمہارا ایک مقصد پورا ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں سازش کرنے والے غیر ملکی ایجنٹ کو سزا ملے گی''۔

''آپ ان کی سیاست نہیں سمجھ رہی ہیں۔ ان کے سامنے ایک بھارتی ایجنٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ سزا کے نام پر اسے قربان کر دیں گے۔ سامنے مرغی ذبح کریں گے۔ پیچھے سے دوسرے بھارتی مرغوں کو تحفظ دینے کو ڈپلومیسی پر عمل کریں گے''۔

میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''ہمیں سیاست نہ سمجھاؤ۔ صرف اپنے گھر کی عزت اور شرافت برقرار رکھنے کی بات کرو۔ اگر میں تمہیں اپنے طور پر زندگی گزارنے کی آزادی دے رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہماری زندگیوں کو کانٹوں کا بستر بنا دو''۔

''ابو! آپ پہلی بار مجھے ڈانٹ رہے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق میری بہتری کے لیے ڈانٹ رہے ہیں لیکن میں اپنے فیصلے کے مطابق جس راہ پر چل رہی ہوں، اس پر نئے نئے چیلنجوں کا سامنا ہوتا ہے''۔

''لڑکیاں میکے میں رہ کر بڑے بڑے فیصلے کرنے کا حق نہیں رکھتیں۔ ان کے بہتر مستقبل کی ذمے داری والدین پر ہوتی ہے۔ تم جب تک ہماری ذمے داری ہو، ہم اپنی عزت اور نیک نامی کے مطابق تمہیں کسی شریف خاندان کی بہو بنانے کی فکر کرتے رہیں گے۔ شادی کے بعد تم جو کرو گی، اس کی ذمے داری ہم پر نہیں، تمہارے مجازی خدا پر ہوگی''۔

اس نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر شباہت کو دیکھ کر بولی۔ ''امی! میں آپ کو اور ابو کو پریشان نہیں ہونے دوں گی۔ کوشش کروں گی کہ ابو کے سر سے ذمے داریوں کا پہاڑ اُتر جائے''۔

یہ کہہ کر، وہ چلی گئی۔ شباہت لائٹ آف کر کے بستر پر آ گئی۔ میں کروٹیں بدلنے لگا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اس نے پوچھا۔ ''آپ جاگ رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میری آنکھوں سے نیند بہت دور ہے مگر تم کیوں جاگ رہی ہو؟''

''کیونکہ آپ جاگ رہے ہیں''۔

''صبح بچے اسکول جائیں گے۔ ان کی خاطر سو جاؤ''۔

''کیسے سو جاؤں؟ زلیخا ایک محبِ وطن صحافی کی حیثیت سے لڑ رہی تھی۔ پھر اچانک یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ہمارے سروں سے ذمے داریوں کا پہاڑ اُتر جائے گا۔ اس کی یہ بات مجھے کھٹک رہی ہے''۔

''مجھے بھی کھٹک رہی ہے۔ میں صبح اسے پیار سے سمجھاؤں گا''۔

میں نے دوسری صبح پیار سے کہا۔ ''بیٹی! اخبار کے دفتر نہ جاؤ''۔

شباہت نے کہا۔ ''تمہارے ابو کھل کر نہیں کہہ رہے ہیں۔ میں کہتی ہوں، اخبار کی ملازمت چھوڑ دو''۔

''آپ ماں ہیں۔ یہ میرا میکا ہے۔ میں یہاں رہ کر بڑے بڑے فیصلے کرنے کا حق نہیں رکھتی ہوں۔ یہ ابو کہہ چکے ہیں۔ میں سمجھ چکی ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں ملازمت چھوڑنے جا رہی ہوں۔ شادی کے بعد یہ ملازمت کروں گی تو پھر میری ذمے داری، آپ دونوں پر نہیں ہو گی''۔

میں نے اور شباہت نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر چلی گئی۔ ملازم صبح آ کر دکان کھول کر صفائی کر دیتا تھا۔ میں دکان میں آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ زلیخا کی آواز سنائی دی۔ ''ابو!''

''ہاں بیٹی! بولو؟''

''امی!''

شباہت نے دوسرے فون کا ریسیور اوپر اپنے کمرے میں اٹھا لیا تھا، وہ بولی۔

''ہاں بیٹی! بولو''۔

زلیخا نے کہا۔ ''آپ دونوں نے میرے ایک ساتھی صحافی عبدالسلام بھٹی کو کل دیکھا تھا، یاد ہے نا؟''

''ہاں، وہ جوان لڑکا مجھے یاد ہے''۔

''سلام اپنی امی اور ابو کے ساتھ شام پانچ بجے آپ دونوں کے پاس آ رہا ہے۔ اس کے والدین میرا رشتہ مانگیں گے، آج منگنی اور

پرسوں شادی......''

میں نے اور شباہت نے بیک وقت پوچھا۔ ''کیا؟''

''میں آپ دونوں کے سر سے ذمے داریوں کا پہاڑ اتار رہی ہوں''۔

''پاگل ہوئی ہو؟ تم پہاڑ ہو؟ ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ تم بوجھ ہو؟''

''میں نے اس دوغلے اخبار کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ اب میرے لئے ہر لمحہ پہاڑ کی طرح گزرے گا۔ میں التجا کرتی ہوں، میری ذہنی حالت کو سمجھیں۔ میں سسرال جا کر دوبارہ صحافتی زندگی گزارنا چاہتی ہوں''۔

شباہت نے کہا۔ ''تمہارا رشتہ آئے گا، ہمیں خوشی ہوگی لیکن ہم تمہیں بوجھ کی طرح اٹھا کر نہیں پھینکیں گے۔ ہماری بیٹی کوئی گری پڑی نہیں ہے کہ آج بات کی اور کل شادی کر کے دوسروں کے حوالے کر دی۔ بعد میں لڑکے والے طعنے دیں گے کہ تم ہمارے لیے مصیبت تھیں''۔

''کوئی طعنہ نہیں دے گا۔ سلام کے والدین ملک کے نامور صحافی ہیں۔ امی! میں ہر حال میں صحافتی زندگی گزاروں گی۔ یہ میرا حق ہے۔ مجھے میرا حق دیں۔ ابو! آپ نے میکے میں میرا حق چھین لیا۔ میں نے گستاخی نہیں کی۔ بغاوت نہیں کی۔ اپنا حق منوانے کا آبرومندانہ راستہ ہموار کر رہی ہوں۔ میں اس یقین کے ساتھ فون بند کر رہی ہوں کہ آپ پرسوں مجھے دلہن بنا کر رخصت کریں گے۔ شادی کے سلسلے میں کوئی دھوم دھام اور نمائش نہیں ہوگی''۔

اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے ہیلو ہیلو کہہ کر فون بند کرنے کا یقین کیا۔ پھر ریسیور رکھ کر بری طرح کی بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ گاہک آ رہے تھے۔ میں ان سے نمٹنے کے لیے حاضر دماغ رہ کر دکانداری نہیں کر سکتا تھا۔ دکان ملازم کے حوالے کر کے اوپر رہائشی حصے میں آ گیا۔

شباہت بھی ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے کہا۔ ''یہ ہماری بیٹی کیا کر رہی ہے؟''

''یہ تو خوش قسمتی ہے کی بیٹی کا رشتہ آ رہا ہے لیکن بیٹی کے ارادے خطرناک ہیں۔ وہ پرسوں شادی کر کے سلام اور اس کے باپ جیسے جرأت مند صحافیوں کے سائے میں جانا چاہتی ہے۔ ان کے ساتھ رہ کر چودھری سراج الدین کے خلاف محاذ بنانا چاہتی ہے''۔

شباہت کی باتوں میں وزن تھا۔ میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے بستر پر پڑے ہوئے اخبار کو دیکھا۔ زلیخا نے پچھلی رات اس اخبار کی ملازمت قبول کی تھی اور آج صبح وہاں سے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ میں نے اس میں لکھے ٹیلی فون نمبر پر رابطہ کیا اور کہا۔ ''ہیلو، میں اخبار کے مدیر اور مالک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں صحافی زلیخا امام کا باپ ہوں''۔

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''زلیخا امام نے ملازمت چھوڑ دی ہے''۔

''میں جانتا ہوں لیکن چودھری سراج الدین صاحب سے ایک اہم معاملے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ براہ مہربانی ان کا فون نمبر بتا دیں''۔

''آپ ہمیں بتائیں کہ اہم معاملہ کیا ہے؟ ہم چودھری صاحب کو بتائیں گے''۔

''مجھے افسوس ہے، میں کسی اخبار والے کو نہیں بتا سکتا۔ اگر آپ نے فون نمبر نہیں بتانا تو میں دوسرے ذرائع سے معلوم کرلوں گا۔ چودھری صاحب سے آپ کی شکایت بھی کروں گا''۔

یہ دھمکی کام آئی۔ اس نے فون نمبر بتائے۔ میں نے پہلا فون نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہوگیا۔ چودھری سراج الدین کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔''میں کل رات والی صحافی زلیخا کا باپ علی امام بول رہا ہوں''۔

''ہوں، کیا بات ہے؟''

''آپ نے ایک بیٹی کے باپ پر احسان کیا ہے۔ آپ سے مزید احسانات چاہتا ہوں۔ زلیخا نادان ہے۔ میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود آپ کے خلاف محاذ بنانا چاہتی ہے''۔

''کیا میرے خلاف کوئی اور تصویری ثبوت ہے؟''

''چودھری صاحب! ذرا ایک منٹ......''

میں نے شباہت سے پوچھا۔''ہمارے پاس چودھری صاحب کی ایک اور تصویر اور نگیٹو ہے نا؟''

شباہت نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے فون پر کہا۔''جی ہاں چودھری صاحب! ہمارے پاس ایک اور تصویر اور نگیٹو موجود ہے۔ ہم ابھی اسے جلادیں گے''۔

''نہیں۔ میں انہیں اپنے ہاتھوں سے جلاؤں گا۔ ابھی میرا ایک خاص آدمی میری ایک پرچی لے کر آئے گا۔ اسے پڑھ کر دونوں چیزیں اس آدمی کو دے دو''۔

''چودھری صاحب! میں آپ کا خادم ہوں۔ آئندہ بھی رہوں گا۔ اس کے صلے میں اپنی بیٹی زلیخا کی ہر طرح سلامتی چاہتا ہوں''۔

''ہمارا وعدہ ہے، تمہاری بیٹی پر آنچ نہیں آئے گی۔ تم بھی اسے لگام دینے کی کوشش کرو''۔

''جناب! وہ بیٹی ہے، ہمیشہ میکے میں نہیں رہے گی اور سسرال میں اس پر ہمارا زور نہیں چلے گا''۔

''ہوں۔ ہمارا زور چلے گا''۔

''مگر......مگر ابھی آپ نے وعدہ کیا ہے، میری زلیخا پر آنچ نہیں آئے گی''۔

''ہم کبھی اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔ تم وہ دونوں چیزیں ہمارے آدمی کو دے دو۔ تمہاری بیٹی کو کبھی نقصان نہیں پہنچے گا''۔

دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں شباہت دوسرے کمرے سے تصویروں کا لفافہ لے آئی تھی اس میں چودھری سراج الدین اور بھارتی ایجنٹ کی دوسری تصویر اور نگیٹو تھے۔ میں نے انہیں لے کر ایک چھوٹے سے لفافے میں رکھ لیا۔ شباہت نے کہا۔''اب ہم پر سے بوجھ اتر گیا ہے۔ زلیخا ان تصویروں کے بغیر کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکے گی اور چودھری صاحب ہماری بیٹی کو کبھی نقصان

نہیں پہنچائیں گے''۔

میں نے کہا۔''اب دانشمندی یہی ہے کہ بیٹی کی خوشی سے اس کی شادی کر دی جائے۔ ہماری بیٹی نے باغی اولاد کی طرح گستاخی نہیں کی ہے۔ بے شک عزت مندانہ راہ ہموار کر رہی ہے''۔

''یوں بھی بیٹیوں کے رشتے مشکل سے آتے ہیں۔ ہمیں اسے رشتے سے انکار نہیں کرنا چاہئے لیکن شادی ایک برس بعد ہوتی تو بہتر ہوتا''۔

''شادی سادگی سے ہوگی۔ اس کے نصیب میں جتنا جہیز ہوگا، اسے دے دیا جائے گا''۔

''جہیز کا اور شادی کا تیاریوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں پھر ماں بننے والی ہوں''۔

''تم مجھے اب بتا رہی ہو۔ ویسے یہ مشکل میں ڈالنے والی بات ہے۔ جوان بیٹی سسرال جائے گی اور چند ماہ بعد ہم ایک بچے کے والدین بنیں گے''۔

''یہی سوچ رہی ہوں۔ کچھ عجیب سا لگے گا''۔

ہم جھینپ رہے تھے۔ جوان بیٹی کو بغاوت کی راہ پر پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ اس سے یہ بات چھپانے والے تھے کہ ہم دوسری تصویر اور نیگیٹو چودھری سراج الدین کے حوالے کر رہے ہیں۔ یہ بات اسے معلوم ہوتی تو وہ ناراض ہو جاتی۔ ہم نے اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا لیکن دوسرا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

اگر چہ اولاد مسئلہ نہیں ہوتی لیکن اس وقت مسئلہ بن گئی تھی۔ میں نے کہا۔''جو خدا کو منظور ہے، وہی ہو رہا ہے۔ اگر ہم شادی کو ایک برس کے لیے ٹال دیں گے۔ تب بھی منگنی تو ہوگی۔ اس کے سسرال والوں سے رشتہ رہے گا۔ باتیں بنانے والے اس وقت بھی باز نہیں آئیں گے۔ یہی کہیں گے کہ جوان بیٹی کی منگنی کر کے بچے پیدا کر رہے ہیں''۔

شباہت نے کہا۔''کیا مصیبت ہے؟ ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ اچانک جوان بیٹی کی منگنی اور شادی کرنی پڑے گی''۔

اس مسئلے پر جتنا سوچا جاتا، اتنی ہی الجھن بڑھتی جاتی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اللہ کی رضا پر راضی رہیں گے

● ● ●

یہ وہ وقت تھا، جب ہمارا ملک تاریخ کے المناک موڑ کی طرف جا رہا تھا۔ سیاست داں جو بیج بو رہے تھے، قوم اس کی زہریلی فصل کاٹنے والی تھی۔ اس سے پہلے ہم نے زلیخا کی شادی کر دی۔ وہ صحافی سلام بھٹی کی شریکِ حیات اور شریکِ صحافت بن کر بھی چودھری سراج الدین کے خلاف مؤثر خبریں شائع نہ کرا سکی۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ خبریں ایسی ہی تھیں جیسے ایک شریف سیاست داں پر خواہ مخواہ کیچڑ اچھالی جا رہی ہو۔

میری بیٹی میری وجہ سے ناکام رہی۔ میں نے اصل ثبوت کی ہوا اسے لگنے نہیں دی۔ میں نے اس کی حفاظت اور سلامتی کی خاطر ملک دشمن سیاست دانوں کے لیے اقتدار تک پہنچنے کا راستہ ہموار کیا۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ مگر دوسرے نہیں کریں گے۔ جرائم کی جڑوں تک پہنچنے والے انٹیلی جنس کے سراغ رساں، پولیس والے، سیاست میں دور کی کوڑیاں لانے والے دانشور، صحافی حضرات مجھ سے زیادہ بصارت اور بصیرت رکھتے ہیں۔ میں نے ایک مجرم سیاست داں کی صرف ایک تصویر ضائع کرائی۔ سیاست کے سمندر میں غوطے لگانے والے مجھ سے زیادہ اہم ترین خفیہ معلومات رکھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ناموں نے خفیہ ڈپلومیسی کی سیڑھیاں بن کر ملک دشمن عناصر کو اقتدار کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

ایک شام فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو، میں ہوں علی امام!''

جواب میں چودھری سراج الدین کی آواز سنائی دی۔ ''تم اپنی بیٹی کے لکھے ہوئے کالم پڑھتے رہتے ہو اور خوش ہوتے رہتے ہو''۔

''جناب! وہ آپ کے خلاف کچھ نہیں لکھ رہی ہے''۔

''میری پارٹی کے خلاف لکھتی رہتی ہے۔ میری پارٹی کو نقصان پہنچانے کا مطلب ہے، وہ مجھے نقصان پہنچا رہی ہے۔ میں انتقامی کارروائی کرنے کے لئے تمہارے مشورے کا محتاج نہیں ہوں لیکن ماضی میں تم میرے بہت کام آئے تھے۔ اس لئے سمجھا رہا ہوں، اپنی بیٹی کو سمجھاؤ، ہماری مخالفت کرنے والے اخبارات میں نہ لکھے''۔

''میں ابھی فون پر اسے سمجھاؤں گا''۔

''میں نے وعدہ کیا ہے، تمہاری بیٹی سلامت رہے گی، اس کے جسم پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آئے گی لیکن میں نے اس کے سسرال والوں کی ذمے داری نہیں لی ہے''۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''تمہاری بیٹی کو کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ پندرہ منٹ پہلے صرف ذہنی صدمہ پہنچا ہے''۔

فون بند ہو گیا۔ میں نے ہیلو ہیلو کہہ کر اسے مخاطب کیا۔ جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے کریڈل کو دبایا۔ دوسرے نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ ہونے پر زلیخا کے شوہر یعنی میرے داماد سلام بھٹی کی آواز سنائی دی۔ آواز بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میں علی امام بول رہا ہوں''۔

''آہ! انکل ہم لٹ گئے۔ کسی دشمن نے میرے ابو کو ہلاک کر دیا......''

وہ آگے کہہ نہ سکا۔ آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''تم...... کیا کہہ رہے ہو...... تم...... تمہارے ابو؟'' ان سے کسی کو دشمنی نہیں تھی۔ پھر......''

ریسیور سے صرف سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''بیٹے صبر کرو، حوصلہ کرو، میں آرہا ہوں''۔

میں نے ریسیور رکھ کر اپنے بیٹے اقبال امام کو دیکھا۔ وہ گیارہ برس کا تھا۔ میز کے پاس بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ دوسرا بیٹا محمد علی پانچ برس کا

تھا۔ وہ میرے بستر پر سو رہا تھا۔ شباہت ہسپتال میں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آج رات یا کل صبح تک زچگی ہو گی۔ میں فون کے ذریعے اسے زلیخا کے سسر کی ہلاکت کی خبر سنانا نہیں چاہتا تھا اور ہسپتال جانے سے پہلے زلیخا کے سسرال جانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے اقبال سے کہا۔ ''یہاں آؤ، میں تمہاری آپی سے ملنے جا رہا ہوں۔ دروازے کو اندر سے بند رکھو۔ جب تک میں واپس آ کر آواز نہ دوں، باہر والا دروازہ نہ کھولنا۔ آؤ، اسے اندر سے بند کر لو''۔

میں اس کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر آ گیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

مغل پورہ میں سلام کے والد نے حویلی نما کوٹھی بنائی تھی۔ وہ اچھے خوش حال لوگ تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ ان باپ بیٹے نے کبھی جان بوجھ کر کسی سے دشمنی نہیں کی لیکن صحافت کا پیشہ ایسا ہے کہ جس بدعنوان شخصیت کو بے نقاب کرو، وہی دشمن بن جاتی ہے۔

اس بار باپ بیٹے نے کسی کو بے نقاب نہیں کیا تھا۔ زلیخا نے چودھری سراج الدین اور اس کی پارٹی کے خلاف مسلسل کالم لکھے تھے۔ چودھری مجھ سے وعدہ کر چکا تھا کہ میری بیٹی کو کبھی کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ اس نے اپنے وعدہ کے مطابق زلیخا کو جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔ اسے ذہنی صدمہ پہنچانے کے لیے اس کے صحافی سسر کو ہلاک کرا دیا۔

میں وہاں پہنچا تو سلام صدمے سے نڈھال تھا۔ میرے گلے لگ کر بولا۔ ''انکل! ابو مجھ پر قربان ہو گئے۔ وہ دشمن مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ بدقسمتی سے وہ گولی ابو کو لگ گئی''۔

میں سلام سے الگ ہو گیا۔ پریشان ہو کر اسے تکنے لگا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ وہ چودھری انتقامی کارروائی کے طور پر میرے داماد کو قتل کر کے، میری بیٹی کو سزا کے طور پر بیوہ بنانا چاہتا تھا۔

سلام نے کہا۔ ''انکل! آپ مجھے بے یقینی سے دیکھ رہے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے کئی بار فون پر دھمکیاں دی گئیں کہ میں زلیخا کو موجودہ کالم نویسی سے باز رکھوں یا اسے موضوع بدل کر لکھنے پر مجبور کروں۔ ورنہ ہاتھ میں قلم رہ جائے گا اور اس کے سر کا تاج گر جائے گا۔ بات صاف ہے، میں ہی زلیخا کا تاج ہوں۔ مجھ پر ہی گولی چلائی گئی تھی۔ ابو کار میں میرے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گولی انہیں لگ گئی''۔

میں نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''تم سچ سمجھ رہے ہو۔ سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے بھی فون پر اطلاع دی گئی ہے کہ میری بیٹی کو صدمہ پہنچایا گیا ہے۔ یہاں آ کر اس اطلاع کی تصدیق ہو رہی ہے''۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا گیا تھا۔ سلام نے اور زلیخا نے چودھری سراج الدین کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی۔ یہی بیان دیا تھا کہ اس کے قاتل سلام کو گولی مارنا چاہتے تھے مگر اس کے ابو گولی کا نشانہ بن گئے۔

اس شہید صحافی کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے اخبارات کے بے شمار صحافی، دانشور اور چند اہم سیاسی شخصیات کے علاوہ لاہور کے اور دوسرے شہروں کی عورتیں اور مرد بڑی تعداد میں آ رہے تھے۔ دوسری صبح شہید صحافی کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ صبح کے اخبارات پڑھے گئے۔ ایک صحافی کی ہلاکت کی خبریں شائع کی گئی تھیں لیکن زلیخا اور سلام کے بیانات کا یہ حصہ شائع نہیں کیا گیا کہ وہ پورے یقین کے ساتھ چودھری

سراج الدین کو قاتل کہہ رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ ثبوت اور گواہوں کے بغیر چودھری سراج الدین کو قاتل نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن شک وشبہ ظاہر کیا جا سکتا تھا۔اس پارٹی کے خلاف اخبارات نے سلام بھٹی کی ایف آئی آر کا ذکر کیا تھا لیکن اس بات کو محض مخالف اخبارات کی مخالفت سمجھا گیا۔میں نے زلیخا اور سلام سے کہا۔''اپنے دشمن کی طاقت کو سمجھو۔ایک تنکا پہاڑ سے ٹکرانے آئے تو پہاڑ کے دامن میں بے بسی سے پڑا رہ جاتا ہے۔چودھری نے مجھ سے فون پر کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔اس کی انتقامی کارروائی دیکھ کر کلیجہ اب تک کانپ رہا ہے۔اگر وہ گولی سلام کو لگ جاتی تو؟''

سلام نے کہا۔''ایک بار نہیں لگی۔دوسری بار تو لگے گی۔یہ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن ہم موت کے ڈر سے مجرموں کے رحم وکرم پر زندگی نہیں گزاریں گے۔فوجی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔گلیوں اور گھروں کی حفاظت تو صحافیوں کو ہی کرنا ہے''۔

وہ جوان نسل جو اپنے دل میں ملک اور قوم کا درد رکھتی ہے،اس سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ایسے جوانوں سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنا گھر بچاؤ،ملک کو اچھے برے سیاست دانوں کے رحم وکرم پر چھوڑو۔سیاست دانوں کی صوابدید پر چھوڑتے چھوڑتے نصف صدی گزر گئی ہے۔میری آپ بیتی،پاک بیتی بن گئی ہے۔میں کہاں تک لکھوں؟ کیا کیا لکھوں؟ کاغذ کالے ہوتے رہیں گے،لیکن اس کی کالک مجرم سیاست دانوں کے دامن تک نہیں پہنچے گی۔وہ پاک دامن ہی رہیں گے۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی بھینسوں کے باڑے میں بیٹھا بین بجا رہا ہے۔بجا تا رہے۔بھینسوں کو درد بھری تان سے کیا لینا ہے؟

مجھے نصف صدی کا قصہ لکھنا ہے۔کیا ضرورت ہے کہ میں بین بجاتا ہوا لکھوں؟

بعد میں پاکستان کے ٹکڑے ہوئے تو کیا ہوا؟ ہندوستان کے بھی ٹکڑے ہوئے تھے۔تب پاکستان وجود میں آیا تھا۔پھر پاکستان کے ٹکڑے ہوئے تو بنگلہ دیش وجود میں آیا۔یہ دنیا کے نقشے میں ہوتا آیا ہے۔ایک کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے تو دوسرے کی تعمیر ہوتی ہے۔

بعد میں میرے داماد سلام بھٹی کے بھی ٹکڑے ہو گئے تو کیا ہوا؟ ہمارے ملک میں بیٹوں اور دامادوں کی فصل کٹتی ہی رہی ہے۔ایسی گھسی پٹی باتیں لکھنے سے،چھاتی کوٹنے سے کیا کسی کا دل پسیجا ہے؟ ہرگز نہیں،یہ تو خوشحال قوم کو خدانخواستہ صدمہ پہنچانے والی بات ہے۔

دراصل میں نے اپنی آپ بیتی کی ابتدا سیاست سے کی یعنی حماقت سے کی۔اپنے جینے اور مرنے والوں کو سیاست میں لپیٹ کر پیش کیا۔اب ایسا نہیں کروں گا۔جو مر چکے ہیں،ان پر فاتحہ پڑھ لی۔جو مرتے جا رہے ہیں،وہ کوئی نیا کام نہیں کر رہے ہیں۔ہم اور آپ تو زندہ ہیں اور جب تک زندہ ہیں تب تک بہار آفریں زندگی کی بات کرتے رہیں گے۔

موت برحق ہے مگر میری گزارش یہ ہے
زندہ انسانوں کا جنازہ نہ اٹھایا جائے

آیئے،اب میرے قلم سے کسی کا جنازہ نہیں اٹھے گا۔نصف صدی کی دلہن پھولوں بھری ڈولی میں سفر کرے گی۔

●●●

میری تین اولادیں ہیں، زلیخا، اقبال اور محمد علی۔ اس کے بعد ایک بیٹی کا اضافہ ہوا۔ ہم نے اس کا نام نورین رکھا۔ ہماری دنیا میں انسان آتا رہتا ہے، جاتا رہتا ہے۔ میرے گھر نورین آئی۔ دو برس بعد میرا داماد سلام بھٹی چلا گیا۔ بے موت مر گیا۔ تین برس بعد زلیخا ٹھیک اپنی ماں شبو کی طرح گلے میں پھندا ڈال کر رخصت ہوگئی۔ میں اس المیے کو بڑے ہی سطحی انداز میں لکھ رہا ہوں۔ موثر انداز میں لکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرا اپنا ہو...... یا پرایا جو بھی جان بوجھ کر موت کو للکارے گا، وہ لازماً مارا جائے گا۔

دل پتھر کرنے کے بعد عقل آتی ہے کہ زندگی گزارنے کا درمیانی راستہ کیسے اختیار کیا جائے؟ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں کہ کوئی ہمارا دوست نہ بن سکے تو دشمن بھی نہ بن سکے۔ میری زندگی تو جیسے گزرنی تھی، ویسے گزر چکی تھی۔ باقی بھی گزر جانے والی تھی۔ میں اپنے بچوں کو پڑھانے اور سمجھانے لگا۔ ان کے سامنے اپنی زندگی کی کتاب کھول کر رکھ دی۔ میرے دونوں بیٹے ذہین ہیں۔ انہوں نے طے کر لیا کہ وقت اور حالات کی نبضیں ٹٹولتے رہیں گے۔ حالات سے سمجھوتا بھی کرتے رہیں گے اور بہترین مواقع سے فائدہ بھی اٹھاتے رہیں گے۔

میرے بڑے بیٹے اقبال نے کامرس میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ اسے انکم ٹیکس کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ وہ بڑی لچھے دار باتیں کرنے کا عادی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں کسی کو بھی دوست بنالیتا تھا۔ اسے کہیں ایک پیر رکھنے کی جگہ ملے تو وہ دوسرا پیر رکھنے کی جگہ خود بنالیتا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیسی ہیرا پھیری کرتا تھا۔ ایک برس کے بعد وہ انکم ٹیکس انسپکٹر بن گیا۔

ایک رات شباہت نے کہا۔ ''میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ آپ برسوں سے دکانداری کر رہے ہیں۔ اس سے آگے کچھ نہ کر سکے۔ وہ ماڈل ٹاؤن میں زمین خرید رہا ہے''۔

گلبرگ کے بعد ماڈل ٹاؤن سب سے مہنگی جگہ تھی۔ وہاں کروڑ پتی اور ارب پتی جاگیر دار اور سرمایہ دار آباد ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایسے سرمایہ دار بھی تھے جو مختلف سرکاری شعبوں میں اعلیٰ عہدے دار تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ محدود تھی لیکن ماڈل ٹاؤن میں ان کی پانچ اور دس کروڑ کی کوٹھیاں تھیں۔ اس بھیڑ میں ہمارے بیٹے اقبال نے پچاس لاکھ روپے کی زمین خرید لی تھی۔

''آرام سے چلنے والے بھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ہم آرام سے چلتے رہے اور ٹھوکریں کھاتے رہے۔ آج کے بچے تیز رفتار ہیں۔ اقبال کہتا ہے، خوف ہر قدم پر ہے سست قدم پر بھی ہے۔ تیز قدم پر بھی ہے۔ پھر گرنے سے خوف کیوں کھائیں؟''

یہ تو میں دیکھ رہا تھا، جو خوف کھاتے ہیں، دوڑ نہیں لگاتے، وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میری طرح ایک دکان کھول کر خوش قسمتی کے انتظار میں بیٹھے رہ جاتے ہیں۔

شباہت نے دوسرے بیٹے کے بارے میں تشویش ظاہر کی۔ ''محمد علی سمجھدار ہے لیکن اقبال کی طرح تیز طرار نہیں ہے۔ پتا نہیں یہ اپنا مستقبل کیسے بنائے گا؟ میں اقبال سے کہتی رہتی ہوں کہ اسے بھی آگے بڑھنے کے راستے پر لگائے۔ دیکھتی ہوں، وہ بھائی کے لیے کیا کرتا ہے''۔

محمد علی میری طرح تھا۔ گھر اور دکان سے آگے نہیں سوچتا تھا۔ اس کی سوچ یہ تھی کہ کہیں سے بڑی رقم مل جائے۔ دکان میں ضرورت کا تمام سامان بھر دے۔ تاکہ کوئی گاہک واپس نہ جائے۔ اس نے دس جماعتیں پاس کرنے کے بعد ایک ٹریننگ سنٹر سے موٹر مکینک کی ڈگری

حاصل کی تھی گاڑیوں کی مرمت کے لیے ایک بڑا سا گیراج کھولنے کے لیے بھی خواب دیکھتا رہتا تھا۔

میں نے اقبال سے کہا۔ ''تم نے پچاس لاکھ کی زمین خریدی ہے۔ وہاں بہت بڑی کوٹھی بنانے کے لیے رقم جمع کر رہے ہو۔ بھائی کو دو چار لاکھ روپے دے دو۔ وہ گیراج کھول کر اچھا خاصا کمانے لگے گا''۔

اقبال نے کہا۔ ''وہ کیا کمائے گا۔ ساری رقم ڈبو دے گا۔ گیراج سے لاکھوں روپے کمائے جا سکتے ہیں لیکن تھوڑی ایمانداری اور تھوڑی بے ایمانی ضروری ہے۔ گیراج میں جو گاڑی آتی ہے، اس کی مرمت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ کچھ دنوں بعد پھر ناکارہ ہو کر مرمت کے لیے آتی رہتی ہے۔ اس طرح گاہک بندھے رہتے ہیں اور مستقل آمدنی کا ذریعہ برقرار رہتا ہے۔ مگر یہ چالاکی محمد علی میں نہیں ہے''۔

محمد علی نے کہا۔ ''بھائی جان! ابو میرے لئے رقم مانگ رہے ہیں۔ نصیحت نہیں مانگ رہے ہیں۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی رقم نہیں ڈوبے گی''۔

اقبال یہ کہہ کر چلا گیا کہ کوٹھی تیار ہو جائے گی۔ تب وہ کچھ رقم دے سکے گا۔ محمد علی نے کہا۔ ''امی! بھائی جان رقم دے سکتے ہیں۔ مگر دینا نہیں چاہتے''۔

شباہت نے کہا۔ ''بیٹے! صبر کرو۔ اس کے ڈپارٹمنٹ میں امتحانات ہو رہے ہیں۔ وہ الجھا ہوا ہے۔ اگر اسے امتحانات میں کامیابی ہو گی تو ترقی ہو گی۔ بڑا عہدہ ملے گا اور تنخواہ بھی بڑھے گی۔ پھر میں اس سے رقم لے کر دوں گی''۔

پھر وہ بڑبڑانے لگی۔ ''دن رات پیسے کمانے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے۔ شادی کے لیے کہتی ہوں تو ٹال دیتا ہے۔ پتا نہیں، کب پوتے اور پوتی کو گود میں کھلاؤں گی''۔

میں نے کہا۔ ''نورین کی فکر کرو۔ تین رشتے آ چکے ہیں مگر دو رشتے تمہیں پسند نہیں آئے۔ ایک رشتے پر اقبال نے اعتراض کیا۔ یہی ہوتا رہا تو بیٹی یہاں بیٹھی رہ جائے گی''۔

''رشتہ کوئی ڈھنگ کا ہو تو بات آگے بڑھائی جائے گی''۔

''بیٹی کے لیے کسی دولت مند کا انتظار نہ کرو۔ ایک شریف گھرانے سے رشتہ آیا تھا۔ وہ عزت سے کماتے کھاتے تھے لیکن تم نے انکار کر دیا''۔

''صرف شریف گھرانا دیکھنے سے تو بات نہیں بنتی۔ ہم بھی تو شریف ہیں۔ ہم نے اولاد کو کون سا سکھ دیا ہے؟ اللہ سلامت رکھے میرے اقبال کو، اس نے زندگی گزارنے کا ڈھنگ ہی بدل دیا ہے۔ شرافت اسے کہتے ہیں کہ بڑے بڑے دولت مند انکم ٹیکس کے کھاتے لیکر اس کے پیچھے پھرتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں کوئی تقریب ہو، میرے بیٹے کو ضرور مدعو کیا جاتا ہے۔ آپ نے تو کبھی اونچی سوسائٹی دیکھی ہی نہیں ہے''۔

میں نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ زندگی گزارنے کا معیار بدل چکا ہے۔ اقبال جس بلندی کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ اسی اونچائی سے

بہن کے رشتے کا انتظار کرے گا۔ اپنے اسٹیٹس سے نیچے اسے کوئی خاندانی لڑکا شریف نظر نہیں آئے گا''۔

میں جو کچھ کہتا تھا، اس میں شکایت نہیں ہوتی تھی۔ بے بسی ہوتی تھی۔ مجھے اس لیے شکایت نہیں تھی کہ میں نے اپنی بیٹی کو اور دونوں بیٹوں کو ان کی اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ میں نے اپنی مرضی کی جتنی زندگی گزاری، وہ قابلِ فخر نہیں تھی۔ اپنی اولاد کے لیے مشعلِ راہ نہیں تھی۔ میرے اور آباؤ اجداد کے جتنے تہذیبی اور روایتی سکے تھے۔ سب کھوٹے پڑ گئے تھے۔ ایک دن اقبال نے ہمارے پاس آ کر کہا۔ ''ابو! امی! یہ محمد علی کسی گیراج میں نوکری نہیں کرتا ہے۔ پھر اس کے پاس بڑی بڑی رقمیں کہاں سے آتی ہیں؟''

''بڑی بڑی رقمیں؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''اس کی جیب میں کبھی بیس پچیس روپے سے زیادہ نہیں رہتے''۔

شباہت نے پوچھا۔ ''تم نے کب اس کے پاس رقم دیکھی ہے؟''

''ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں۔ انارکلی میں ایک عورت کے ساتھ تھا۔ وہ اپنی پسند کی شاپنگ کر رہی تھی۔ اور آپ کے صاحبزادے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر بل ادا کر رہے تھے۔ شاپنگ کرانے کے بعد اسے ایک کار میں بٹھا کر کہیں لے گئے''۔

''بیٹے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کار کس کی تھی؟''

''میں کیا جانوں؟ ایک ہفتہ پہلے میں نے اسی کار میں اسے دیکھا تھا۔ اس وقت یہ سمجھ میں آیا کہ کسی دوست کی کار چلا رہا ہو گا۔ دیکھیے، میں بڑے بڑے رئیسوں اور خاندانی لوگوں میں اپنی عزت بنا کر رکھتا ہوں۔ اگر یہ بات پھیلے گی کہ میرا بھائی کسی عورت کے پیچھے دُم ہلاتا رہتا ہے تو میری عزت خاک میں مل جائے گی''۔

میں نے کہا۔ ''محمد علی نادان نہیں ہے۔ اسے صرف تمہاری ہی نہیں، میری بھی عزت کا خیال ہے''۔

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''آپ نے کیا عزت بنائی ہے۔ پتا ہے، میں امتحان میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میری ترقی ہونے والی ہے۔ بہت بڑا عہدہ ملنے والا ہے۔ اب میں ماڈل ٹاؤن کی زمین پر اپنی شاندار کوٹھی بناؤں گا۔ وہاں ایک نہیں دو دو کاریں ہوں گی''۔

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ہمیں حیرانی سے دیکھ کر بولا۔ ''آپ دونوں نے سر کیوں جھکا لیے ہیں۔ میں اتنی بڑی کامیابی کی خبر سنا رہا ہوں اور آپ خوش نہیں ہو رہے ہیں''۔

شباہت نے کہا۔ ''ہم آج نہیں، کل خوش ہو لیں گے۔ آج اس بات پر شرمندہ ہونے دو کہ تمہارے خیال کے مطابق ابو نے کوئی عزت نہیں بنائی ہے۔ اب تک بے عزتی کی زندگی جیتے آ رہے ہیں''۔

''آں؟'' وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ روانی میں مجھے کیا کہہ گیا ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے ہم دونوں کو دیکھا پھر کہا۔ ''وہ......آپ......آپ میری بات کا غلط مطلب نہ لیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ابو نے عزت نہیں کمائی ہے۔ میں نے ترقی کی رفتار کے حوالے سے کہا ہے کہ ہمارے بزرگ جو کماتے ہیں، ان کی اولاد زمانے کی تیز رفتاری کی مناسبت سے ان کے مقابلے میں زیادہ کماتی ہے۔ خواہ دولت کمائے یا عزت کمائے''۔

میں نے کہا۔ ''ہمارا دل صاف نہ کرو۔ ماں باپ کا دل اولاد کی طرف سے کبھی میلا نہیں ہوتا۔ جاؤ اور کماؤ''۔

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ نادم ہو کر گیا ہے۔ آج کے بچے شرمندہ ہو کر بزرگوں کے آگے نہیں جھکتے۔ دور سے صفائی پیش کر کے چلے جاتے ہیں۔

● ● ●

نورین کالج سے آئی۔ شباہت نے کہا۔ ''گھڑی دیکھو، تین بج رہے ہیں۔ اب تو تم روز ہی دیر سے آنے لگی ہو''۔

وہ میرے پاس بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ''ابو! میں امی کو بتا چکی ہوں کہ کیمسٹری کی پریکٹیکل کلاس ہونے لگی ہے۔ پھر بھی انہیں فکر لگی رہتی ہے کہ جوان بیٹی کہاں رہ گئی ہے؟''

''میں ماں ہوں۔ فکر تمہارے باپ کو نہیں، مجھے ہو گی''۔

''امی! جو لڑکیاں اسکول اور کالج جاتی ہیں، ان پر اعتماد کرنا چاہئے۔ وہ لڑکیاں اور ہوتی ہیں، جن کی آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے۔ اب میں کیا کہوں؟ ابو کچھ کہیں نا؟''

میں نے شباہت سے کہا۔ ''کتنی بار کہہ چکا ہوں۔ دونوں بیٹوں کی طرح بیٹی کو بھی اپنی زندگی گزارنے دو لیکن تم کسی نہ کسی بات پر اسے روکتی رہتی ہو''۔

''یہ اپنے گھر کی ہو جائے گی تو ایسا جرم نہیں کروں گی''۔

''ایک تو امی کو دن رات میری شادی کی فکر کھائے جاتی ہے۔ میں کہہ چکی ہوں۔ یہ رشتہ لے کر آنے والیاں مجھے ذرا اچھی نہیں لگتیں۔ ایسے دیکھتی ہیں جیسے قربانی کے جانور کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے اپنی توہین کا احساس ہوتا ہے''۔

شباہت نے کہا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو، رشتے گھر میں نہیں تو کیا باہر ہوتے ہیں''۔

''باہر بھی رشتے ہو جاتے ہیں۔ آپی مرحومہ نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی نا؟''

''کیا؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کیا اپنی مرضی سے شادی کرو گی؟ آپ سن رہے ہیں، چپ کیوں بیٹھے ہیں؟''

''اس لیے چپ ہوں کہ زلیخا نے واقعی اپنی پسند سے شادی کی تھی''۔

''آپ بیٹی کو شہ دے رہے ہیں؟''

''بیٹوں کی طرح بیٹی پر بھی اعتماد کر رہا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے، میری بیٹی ہماری نیک نامی پر آنچ نہیں آنے دے گی''۔

''اوا بو! آپ میرے ابو بھی ہیں، میرے دوست بھی۔ آئی لو یو''۔

وہ میری پیشانی کو بوسہ دے کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شباہت نے کہا۔ ''یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ بیٹوں کی بات اور ہے۔ بیٹیوں کو اتنا سر نہیں چڑھانا چاہئے''۔

''سر چڑھنے والی بیٹیاں کبھی باپ کا سر جھکنے نہیں دیتیں۔ میں اپنی بیٹی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم بیٹی پر نہ سہی، مجھ پر اعتماد کرو''۔

وہ بستر پر لیٹ کر کراہتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہائے، یہ کمر کا درد اٹھتے اور لیٹتے وقت پتا چلتا ہے، بڑھاپا کتنی جلدی آ گیا ہے۔ آپ تو اس عمر میں بھی تن کر چلتے ہیں''۔

''تمہاری خوشی کے لیے جھک کر چلا کروں؟''

''مذاق نہ کریں۔ اب اس چھوٹے نے فکر میں ڈال دیا ہے۔ پتا نہیں، کس عورت کو شاپنگ کرا رہا تھا۔ میرا بچہ بہت بھولا ہے، نادان ہے، یہ شاپنگ کرنے کرانے والی عورتیں اچھی نہیں ہوتی ہیں''۔

''تم بیٹی کے دیر سے گھر آنے پر اعتراض کر رہی تھیں۔ محمد علی آدھی آدھی رات کو آنے لگا ہے۔ تم اسے نظر انداز کرتی رہتی ہو''۔

''بیٹی پر اعتراض کیا تو آپ بیٹے کیلیے طعنہ دے رہے ہی۔ وہ مرد بچہ ہے، آدھی رات کو بھی گھر آئے گا تو بدنامی ساتھ نہیں لائے گا''۔

''پھر اس کے لیے پریشان کیوں ہو رہی ہو؟''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر کروٹ بدل کر منہ پھیر لیا۔ بڑھاپے میں ممتا بھری پریشانیاں سکون سے رہنے نہیں دیتیں لیکن اس بے سکونی میں غیر شعوری طور پر ممتا کو آرام آتا رہتا ہے۔

محمد علی نے آدھی رات نہیں کی۔ شام ہی کو آ گیا۔ آتے ہی بولا۔ ''ابو! خوشخبری سنیں، مجھے ایک گیراج چلانے کا ٹھیکہ مل گیا ہے۔ میں اسلام آباد جا رہا ہوں''۔

''آدھی خوشی کی اور آدھی اداسی کی بات کر رہے ہو۔ ہم سے دور اسلام آباد جاؤ گے''۔

''امی! آپ بھی یہی کہیں گی۔ جبکہ لوگ زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے دبئی اور امریکہ جاتے ہیں''۔

شباہت نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چولہے میں گیا دبئی اور امریکہ۔ یہ بتاؤ، کس عورت کو شاپنگ کرا رہے تھے؟''

''کیا؟'' محمد علی نے چونک کر مجھے اور اپنی ماں کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''یہ شاپنگ کرانے والی بات آپ سے کس نے کہی ہے؟''

''کسی نے بھی کہی ہے، یہ سچ ہے یا نہیں؟''

''پہلے آپ اس خبر رساں ایجنسی کا نام اور پتا بتائیں؟''

''بتانے والا کوئی دشمن نہیں ہے۔ تمہارا بھائی ہے۔ تمہاری بھلائی چاہتا ہے''۔

''او...... اچھا۔ بھائی اور بھلائی! واہ، آج تک اتنی بھلائیاں کی ہیں کہ اپنی طرح مجھے بھی مالا مال کر دیا ہے۔ میں اپنا فیوچر بنانے کے لیے نہیں بھٹک رہا ہوں۔ پچھلے چار برسوں سے ایک اچھے روزگار کے لیے ٹھوکریں نہیں کھا رہا ہوں۔ آپ والدین ہیں۔ میں بھائی ہوں۔ آئیں ہم سب فخر کریں کہ ایک بھائی نے اپنی لاکھوں کی کمائی سے کبھی چھوٹے بھائی کو عیدی بھی نہیں دی''۔

اقبال نے کمرے میں آ کر کہا۔ ''کیوں چیخ رہے ہو؟ کسے فریاد سنا رہے ہو؟ چلو میں دنیا والوں سے کہتا ہوں کہ میرے ذرائع بڑی

دور تک ہیں۔ اسکے باوجود میں نے تمہیں کہیں ملازمت نہیں دلائی۔ کیوں دلاؤں؟ کیا میں ابو سے شکایت کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے کہیں ملازمت سے کیوں نہیں لگایا؟ میں پانی پینے کیلئے کنواں کھود رہا ہوں۔ تم کنواں کھودنے کی مشقت سے بچنے کے لیے مجھ پر کیوں چیخ رہے ہو؟''

''نہ آپ پر چیخ رہا ہوں، نہ آپ کا محتاج ہوں۔ میں بھی اسلام آباد میں لاکھوں روپے کمانے جا رہا ہوں۔ یہ نہ کہنا کسی معمولی گیراج میں جا کر بیٹھوں گا۔ وہاں چھینی ہوئی اور اسمگل کی ہوئی مہنگی گاڑیاں آتی ہیں۔ لاکھوں کی ہیرا پھیری ہوتی ہے۔ میں مکینک ہوں، گاڑیوں کے انجن، پارٹس، پرزے اور چیسز نمبر وغیرہ ایسی مہارت سے بدل سکتا ہوں کہ ان پر کبھی چوری کا الزام نہیں آسکتا''۔

اقبال نے حقارت سے کہا۔''چور ہے، چوری کا ہی دھندا کرے گا''۔

''بھائی جان! چھوٹا ہوں، چھوٹی چوری کروں گا۔ آپ بڑے بھائی ہیں، کروڑوں اور اربوں روپے کی ٹیکس چوری پر پردہ ڈالتے ہیں''۔

میں نے ڈانٹ کر کہا۔''یہ کیا ہو رہا ہے؟ خاموش ہو جاؤ''۔

''ابو! یہ بڑے بھائی ہیں۔ چھوٹے کو حقارت سے طعنہ دیں گے تو چھوٹا بھی انہیں ان کی اوقات سمجھائے گا''۔

شباہت نے محمد علی سے کہا۔''چھوٹے! چپ ہو جاؤ''۔

''امی! پہلے انہوں نے مجھے چور کہا۔ انہوں نے آپ سے چغلی کھائی کہ میں کسی عورت کو شاپنگ کرا رہا تھا''۔

اقبال نے کہا۔''امی کی قسم کھا کر کہو، تم انار کلی میں اس عورت کے ساتھ نہیں تھے؟''

''ہاں تھا، کیا آپ جانتے ہیں، وہ عورت کون تھی؟ دسویں میں میرا ایک ہم جماعت اکبر حسین تھا، وہ اکبر حسین کی ماں تھی''۔

''ماں؟'' شباہت نے کہا۔''اقبال، تم نے بھائی کی شکایت کی مگر اس عورت کی عمر نہیں بتائی؟ تم نے اسے ہماری نظروں سے گرایا۔ ہمیں بھی تشویش میں مبتلا رکھا''۔

''امی! یہ باتیں بنا رہا ہے۔ اگر وہ اس کے دوست کی ماں تھی تو ان کے ساتھ دوست کیوں نہیں تھا؟''

محمد علی نے کہا۔''وہ مر چکا ہے۔ ایک تو وہ اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ اٹھا رہی ہے۔ دوسرے کاروبار کی فکر ہے۔ میرا دوست بہت بڑے گیراج کا مالک تھا۔ اس کی ماں نے کہا کہ کاروبار کے سلسلے میں مجھ پر اعتماد کرے گی۔ کیونکہ اس کے بیٹے سے میری گہری دوستی تھی۔ وہ مجھے ففٹی پرسنٹ پر گیراج کا ٹھیکہ دے رہی ہے''۔

میں نے کہا۔''اقبال! بڑے افسوس کی بات ہے۔ ہم سے کچھ کہنے سے پہلے تمہیں اس عورت کی عمر کا تو لحاظ کرنا چاہئے تھا''۔

''سوری ابو! اور کیا کہوں؟ سوری ہی کہہ سکتا ہوں۔ میرا سوری کہنا پسند نہ ہو تو مجھے پھانسی پر چڑھا کر چھوٹے کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیں''۔

یہ کہتے ہی وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ اس کی کامیابیوں نے اور آئے دن ہونے والی اندھی کمائی نے اسے خودسر بنا دیا تھا۔ وہ اپنی سوسائٹی میں اور اپنے گھر میں خود کو برتر سمجھنے لگا تھا۔ مجھ سے اور اپنی ماں سے بھی خشک لہجے میں بولتا تھا۔ شباہت مجھ سے کہتی تھی۔''آپ

خیال نہ کریں، آخر خون ہمارا ہی ہے۔ بس ذرا ضدی ہے''۔

بچہ جوان ہو کر ضدی ہو۔ دونوں ہاتھوں سے کماتا ہو تو اپنے ماں باپ کا بن جاتا ہے اور اب اپنے بیٹے کی برتری تسلیم کر کے اس کی رضا میں راضی رہتا ہے۔ یہ دستور چلا آرہا ہے۔ میں بھی حسب دستور اولاد سے راضی تھا۔

میری دکان کے اوپر رہائشی حصے میں صرف تین کمرے تھے۔ ایک کمرا اقبال کے لیے وقف تھا۔ دوسرے کمرے میں شباہت اور نورین رات کو سوتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں محمد علی بچپن سے میرے ساتھ رہتا اور سوتا آیا تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے بعد اٹیچی میں ضروری سامان رکھ کر ہم سے رخصت ہو گیا۔

میں نے شباہت سے کہا۔''پہلی بار میرا بیٹا مجھ سے دور گیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اپنے اندر کہیں سے خالی ہو گیا ہوں''۔

''ہمارا اور اس کا آنا جانا اور ملنا ملانا الگ سی بات ہے۔ مگر رات کو یہ کمرا اس کے بغیر ویران رہے گا۔ میں تمہارات سے صبح کیسے کروں گا؟ مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اس کا بستر خالی دکھائی دے گا''۔

''میں آپ کی محرومی سمجھتی ہوں۔ یہ آنکھیں اولاد کو بچپن سے دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ انہیں نہ دیکھو تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم کچھ اور بوڑھے ہو گئے ہیں۔ یہ بچے اپنے ساتھ ہماری توانائی لے جاتے ہیں''۔

پھر شباہت نے اقبال سے کہا۔''بیٹے! آج تم یہاں سو جاؤ''۔

''میں؟'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔''ہم سب آس پاس کے کمروں میں ہیں۔ ابو، بچے تو نہیں ہیں کہ اکیلے یہاں ڈر لگے گا؟''

''ہم بڑھاپے میں بچے بن جاتے ہیں۔ ہمیں اولاد کی محرومی ڈراتی ہے''۔

''آپ جانتی ہیں، مجھے تنہا کمرے میں سونے کی عادت ہے۔ نیند کے وقت کوئی کمرے میں آئے تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ آپ اور نورین، ابو کے پاس رہیں۔ مجھے جلدی سونا ہے اور صبح جلد جانا ہے''۔

وہ کوئی جواب سنے بغیر میرے کمرے سے چلا گیا۔ ایک بیٹا ایک شہر سے دوسرے شہر گیا۔ دوسرا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گیا۔ کوئی بات نہیں، تنہا راتیں گزارنے کا بھی عادی ہونا تھا۔ اس طرح تنہا پہاڑ جیسا بڑھاپا گزارنے کا عادی ہو جاتا۔

● ● ●

نورین نے ٹھیک ہی کیا، جیسا کبھی زلیخا نے کیا تھا۔ زلیخا نے فون پر کہا تھا۔''سلام اپنی امی اور ابو کے ساتھ آرہا ہے۔ اس کے والدین میرا رشتہ مانگیں گے''۔

اسی طرح نورین کالج گئی تھی۔ اس نے کہیں سے فون کیا۔ میں دکان میں تھا۔ میں نے دکان کے فون کا ریسیور اٹھایا۔ شباہت نے اوپر کمرے سے ریسیور اٹھا کر کہا۔''ہیلو!''

نورین کی آواز سنائی دی۔ ''امی! جاوید صاحب اپنی امی اور ابو کے ساتھ گھر آ رہے ہیں۔ ان کے والدین میرا رشتہ مانگیں گے''۔

میں نے اور شباہت نے بیک وقت حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا؟''

''ابو! وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ بہت اچھا خاندان ہے۔ جاوید ظفر پولیس انسپکٹر ہیں''۔

شباہت نے پوچھا۔ ''تم جاوید ظفر کو کیسے جانتی ہو؟''

''امی! گھر سے باہر جانے آنے والی لڑکیاں صرف دنیا نہیں دیکھتیں، اپنے مستقبل کے معمار کو بھی ڈھونڈتی ہیں۔ اپنے والدین کے سروں سے مسائل کا بوجھ بھی اتارتی ہیں۔ میں نے بوجھ اتارنے کے لیے اخلاقی تقاضوں کے خلاف کوئی نادانی نہیں کی ہے۔ آپ مجھے ماں کا تھوڑا سا اعتماد دیں''۔

میں نے کہا۔ ''شباہت! اسے مثبت جواب دو''۔

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم جاوید ظفر کے والدین کو ویلکم کہیں گے''۔

''امی! میری گذارش ہے، آپ رشتے کو بھی ویلکم کہیں گی......''

''ہم تو اچھا برا سمجھنے والے کوئی نہیں ہیں۔ جب تم نے آخری فیصلہ کر ہی لیا ہے تو انہیں رشتہ مانگنے کے لیے کیوں بھیج رہی ہو؟ ان سے کہہ دو، بارات لے کر آ جائیں اور تمہیں لے جائیں''۔

میں نے کہا۔ ''نورین! ہم تمہاری ایک بات مان رہے ہیں۔ دوسری بات کے لیے گذارش نہ کرو۔ ہم بزرگوں کو بھی اپنے طور پر فیصلہ کرنے کا حق دو''۔

''آل رائٹ ابو! میں اس سلسلے میں اب کچھ نہیں بولوں گی''۔

اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے شباہت کے پاس آ کر کہا۔ ''ہمیں بیٹی کی باتوں سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اپنے طور پر جاوید ظفر کو اچھی طرح پرکھا اور سمجھا ہے۔ ہم اس کے والدین سے۔ ''ہاں یا نہ'' کا جواب دینے کے لیے کچھ مہلت مانگیں گے۔ اقبال سے کہیں گے کہ وہ جاوید ظفر اور اس کے خاندان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرے''۔

''یہ ٹھیک ہے۔ میرا بیٹا ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکے گا''۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ''کیا آپ جناب علی امام ہیں؟''

''ہاں۔ آپ کون ہیں؟''

''انکل! میں جاوید ظفر بول رہا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ...... کہ میرا غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔ آپ مجھے پہچان رہے ہیں نا؟''

میں نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر شباہت سے کہا۔ ''جاوید ظفر ہے''۔

میں نے ریسیور کے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ''میں پہچان رہا ہوں''۔

شباہت فوراً ہی اٹھ کر میرے پاس آگئی اور ریسیور سے کان لگا کر سننے لگی۔ جاوید نے کہا۔''انکل! میں اپنے والدین کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں''۔

''بیٹے میں اتنی جلدی کیا کہہ سکتا ہوں۔ ایسا کرو، اپنا فون نمبر دو۔ میں آج یا کل تمہیں فون کروں گا''۔

اس سے فون نمبر بتایا۔ میں نے نوٹ کرلیا۔ اس نے کہا۔''میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔ آپ کی اجازت ہو تو فون بند کروں؟''

میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ شباہت نے کہا۔

''یہ آپ نے اچھا کیا۔ اس نے فون نمبر لے لیا۔ اب ہم سوچ سمجھ کر انہیں بلائیں گے''۔

اس نے ریسیور اٹھا کر اقبال کے دفتر فون کیا اور رابطہ ہونے پر بولی۔''بیٹے! میں تمہاری ماں ہوں''۔

''امی! خیریت......؟ آپ نے اس وقت فون کیا ہے۔ میں دفتر سے اٹھ ہی رہا ہوں، گھر آرہا ہوں''۔

''تو پھر جلدی آجاؤ۔ بہت ضروری بات کرنی ہے''۔

اس نے دوسری طرف سے بیٹے کی گفتگو سنی پھر ریسیور رکھتی ہوئی بولی۔''اقبال آرہا ہے''۔

وہ چار گھنٹے بعد آیا۔ شباہت نے کہا۔''تم فوراً آنے والے تھے، اتنی دیر کیوں ہوگئی؟''

''اتنی بڑی کوٹھی بنوا رہا ہوں۔ وہاں زیادہ سے زیادہ وقت دینا ضروری ہے۔ آپ سے وعدہ نہ کرتا تو اور دیر سے آتا۔ ویسے ضروری بات کیا ہے؟''

''نورین کا رشتہ آرہا ہے۔ لڑکے والے آنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں پہلے تم ان کے بارے میں چھان بین کرو''۔

''کسی رشتہ لانے والی نے ان کے متعلق کچھ بتایا ہوگا''۔

لحاف

عصمت چغتائی اردو زبان میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے...... منٹو کی طرح عصمت کا قلم بھی معاشرے کے حساس موضوعات کی نشاندہی کرتا رہا اور اس پر بھی اکثر اوقات فحش نگاری کا الزام لگتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول اردو ادب کا لازمی جزو ہیں۔ **لحاف** عصمت کے 11 بہترین منتخب افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں جوانی، لحاف، پہلی لڑکی، باندی، ایک شوہر کی خاطر، نئی دلہن، تل، عورت، خرید لو، بہو بیٹیاں اور ڈائن افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **افسانے** سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

''اتنا معلوم ہوا ہے، لڑکے کا نام جاوید ظفر ہے۔ پولیس انسپکٹر ہے۔ خاندان اچھا ہے''۔

''بس امی! وہ پولیس میں بھی ہے اور خاندان بھی اچھا ہے۔ یہ تو ایسی بات ہے جیسے کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ چوری بھی کرتا ہے اور نماز بھی پڑھتا ہے''۔

میں نے کہا۔''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں شریف اور ایماندار لوگ نہیں ہوتے؟ اگر تم نے اچھے لوگ نہیں دیکھے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری دنیا میں اچھے لوگ نہیں رہے ہیں''۔

اس نے کہا۔''چلیں میں پولیس والوں کی برائی نہیں کروں گا لیکن یہ تو مان لیں کہ وہ خطرات سے کھیلتے رہتے ہیں۔ پولیس مقابلوں میں کبھی ڈاکو اور مفرور قیدی مارے جاتے ہیں اور کبھی پولیس والے مارے جاتے ہیں۔ کیا آپ نورین کو آج سہاگن اور کل بیوہ بنانا چاہتے ہیں؟''

شباہت نے کہا۔''توبہ۔ اللہ معافی۔ میرے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ میں کسی پولیس والے سے بیٹی کی شادی نہیں کروں گی''۔

میں نے کہا۔''اقبال! اپنی ماں کے دماغ میں یہ کیسی بات ٹھونس رہے ہو۔ کیا موت صرف پولیس والوں کو آتی ہے؟ سرحد کے فوجی جوانوں کو نہیں آتی ہے؟ ملک کے اندر اور گھر کے اندر رہنے والوں کو موت نہیں آتی؟''

''آپ کچھ بھی کہتے رہیں۔ میرے بیٹے نے آپ سے زیادہ عقل کی بات کی ہے۔ میں صاف کہے دیتی ہوں، میرے گھر میں پولیس والے رشتہ مانگنے نہیں آئیں گے''۔

میں نے ناراضگی سے اقبال کو دیکھا، اس نے کہا۔''ابو! میری پوزیشن کا خیال کریں۔ اس کوٹھی کی تعمیر میں ایک کروڑ سے زیادہ لاگت آئے گی۔ ہم سب کو وہاں رہ کر ہائی لیول پر زندگی گزارنی ہے۔ میری، محمد علی اور نورین کی شادیاں بھی ہائی لیول پر ہوں گی۔ کیا آپ ایک معمولی پولیس انسپکٹر کو داماد بنا کر ہمارا امیج گرائیں گے؟''

''بیٹے! میں کیا گراؤں گا؟ میں تو تم میں سے کسی کو اونچا نہ اٹھا سکا۔ اس گھر میں جو ہو رہا ہے، وہ تم سب کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ نورین کی بھی اپنی مرضی ہے۔ میں تم بیٹوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا ہوں۔ تمہیں مشورہ دیتا ہوں، نورین کی پسند کو پسند کرلو''۔

''کیا؟'' اقبال نے حیرانی سے پوچھا۔''رشتہ مانگنے والے نورین کی مرضی سے آنے والے ہیں؟''

شباہت نے کہا۔''ہاں آنے والے تھے۔ اب نہیں آنے دوں گی۔ اپنی بیٹی کو بیوہ بنانے کی حماقت نہیں کروں گی''۔

''ابو! آپ نے نورین کو بے جا آزادی دی ہے۔ کیا شریف زادیاں اس طرح باہر جا کر اپنے لیے رشتہ پسند کرتی ہیں؟''

میں نے کہا۔''میں معلومات حاصل کروں گا۔ اگر نورین کی پسند میری پسند کے مطابق ہوگی تو میں ان سے کہوں گا، تاریخ طے کریں۔ بارات لائیں اور اپنی امانت لے جائیں''۔

''ابو! آپ اپنا فیصلہ سنا رہے ہیں اور میں اپنا فیصلہ سنا رہا ہوں، نورین کی شادی کسی پولیس والے سے ہوگی تو میں گھر چھوڑ کر، شہر چھوڑ کر اور یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا''۔

"ہائے ہائے بیٹا! جائیں تمہارے دشمن، کیا ماں کو چھوڑ کر جاؤ گے؟ بڑھاپے میں تمہارے باپ کی عقل دو پیسے کی نہیں رہی ہے۔ زلیخا کو بیوہ ہوتے دیکھا۔ اب دوسری بیٹی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دیکھنا چاہتے ہیں، تمہیں بزرگوں سے بغاوت کرنا سکھا رہے ہیں۔ ماں سے جدا کر دینا چاہتے ہیں"۔

اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں پوچھتی ہوں، آپ کو ہوا کیا ہے؟ کیا آپ سچ مچ یہ چاہتے ہیں کہ بیٹا چلا جائے اور آپ بیٹے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہیں؟"

"تم مجھ سے نہ پوچھو، کیا یہ ماہانہ لاکھوں روپے کی آمدنی چھوڑ کر جا سکے گا؟"

اقبال نے کہا۔ "نہیں جاؤں گا۔ اب میں صاف صاف کہتا ہوں، آپ میری ملازمت کا اور اوپر کی آمدنی کا خیال کریں۔ کوئی پولیس والا ہمارے خاندان میں آئے گا تو میری نصف آمدنی کا حصہ دار بن جائے گا۔ اگر وہ ایماندار ہو گا تو مجھے ہتھکڑی پہنا دے گا"۔

"ہائے میں مرجاؤں۔ اب تو میری جان بھی چلی جائے، میں کسی پولیس والے کو رشتے دار نہیں بناؤں گی۔ اقبال! تم جاؤ، غسل کرو۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں"۔

وہ غسل کرنے چلا گیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ ہم سلام اور زلیخا کی المناک ہلاکت کے بعد اپنے مزاج میں باغیانہ تبدیلی لے آئے تھے۔ منفی طرزِ عمل سے زندگی گزار رہے تھے اور ایسی زندگی گزارنے کے لیے ایسی رازداری لازمی ہے کہ باہر کا کوئی آدمی، خصوصاً قانون کا کوئی ایماندار محافظ ہمارے خاندان میں نہ آئے۔

شباہت تھوڑی دیر بعد کھانا گرم کرنے کچن میں چلی گئی۔ اقبال غسل سے فارغ ہو کر لباس بدل کر ماں کے کمرے میں کھانے بیٹھ گیا۔ اسی وقت نورین آگئی۔ شباہت نے اپنے کمرے میں بیٹے کے پاس بیٹھے بیٹھے مجھ سے کہا۔ "بیٹی کو گھڑی دکھائیں۔ اب تو بات سمجھ میں آگئی ہے کہ باہر رشتہ جوڑنے میں دیر ہو جایا کرتی ہے"۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "شباہت! زبان کو قابو میں رکھو۔ تم کس انداز میں باہر رشتہ جوڑنے والی بات کہہ رہی ہو؟ اپنی بیٹی کے لیے کہہ رہی ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے"۔

شباہت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ خاموش رہی۔ نورین میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ "بیٹی! تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے لیکن تمہاری خوشی پوری کرنے کے سلسلے میں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے"۔

"کیسا مسئلہ؟"

"تم اپنے بھائی جان کی کالی کمائی کے بارے میں جانتی ہو۔ ایک پولیس انسپکٹر داماد بن کر ہمارے خاندان میں آئے گا تو تمہارے بھائی جان کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے مصیبت بن جائے گا"۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جاوید ان کی کالی کمائی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں گے"۔

''جب پولیس والے چھوٹ دیتے ہیں تو اپنا حصہ بھی وصول کرتے ہیں''۔

''وہ آپ کی بیٹی کی خاطر صرف رشتے دار بنیں گے، حصے دار نہیں۔ میں یقین دلاتی ہوں''۔

''تمہارا بھائی کبھی یقین نہیں کرے گا۔ وہ اپنی کمائی میں سے کسی کو حصہ دینا گوارا نہیں کرے گا''۔

''آپ بھائی جان کو بلائیں، میں بات کروں گی''۔

میں نے آواز دی۔ ''اقبال! کھانے سے فراغت پا کر یہاں آؤ''۔

شباہت اپنے کمرے سے آئی۔ ہمیں دیکھ کر بولی۔ ''باپ بیٹی میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میں بھی تو سنوں، لاڈلی کیا کہہ رہی ہے؟''

نورین ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''ہیلو، میں بول رہی ہوں''۔

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر کہا۔ ''ہمیں جس بات کا اندیشہ تھا، وہی بات ہو رہی ہے''۔

شباہت آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ ''یہ کس سے بات کر رہی ہے۔ آپ اسے فون کرنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''چوری نہیں کر رہی ہے۔ ہم بزرگوں کے سامنے بات کر رہی ہے''۔

وہ بیٹی کے پاس آکر بولی۔ ''نورین! فون بند کرو۔ یہ ماں کا حکم ہے''۔

وہ ریسیور کان سے لگا کر بولی۔ ''کیا؟ پولیس آ رہی ہے؟''

شباہت ریسیور چھیننے جا رہی تھی۔ ایک دم سے سہم کر ایک قدم پیچھے ہو گئی۔ نورین کہہ رہی تھی۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں، کیا یہاں آ رہی ہے؟''

اقبال کھانا چھوڑ کر آ گیا۔ شباہت نے کہا۔ ''بیٹے! یہ دیکھو کیا کہہ رہی ہے؟ پولیس آ رہی ہے۔ مگر کیوں آ رہی ہے؟''

وہ بہن کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بھائی جان! میں نے امی کو روکنے کے لیے جھوٹ کہا ہے۔ بھلا پولیس یہاں کیوں آئے گی۔ مگر ہاں، یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پولیس کی دوستی اچھی ہوتی ہے، نہ دشمنی۔ فون پر انسپکٹر جاوید ہیں۔ آپ ریسیور لیں۔ ان سے کہہ دیں کہ آپ مجھے ان سے منسوب نہیں کریں گے۔ صاف اور سیدھے لفظوں میں شادی سے انکار کر دیں''۔

وہ غصے سے بولا۔ ''میں کیوں بات کروں؟ آگ لگائی ہے تم نے، بجھاؤں گا میں؟''

''میں آگ لگاتی تو جل جاتی...... جل آپ رہے ہیں۔ آپ ہی کو آگ بجھانا چاہئے''۔

شباہت نے کہا۔ ''میرے بیٹے کو کیوں الجھا رہی ہو؟ کیوں پولیس والے کو میرے بیٹے کا دشمن بنا رہی ہو؟''

''میں ابو سے کہہ چکی ہوں کہ جاوید میرے بھائی جان کے دشمن نہیں ہیں۔ وہ تو الٹا فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں''۔

اقبال نے پوچھا۔ ''کیسا فائدہ؟''

''آپ اس معاملے میں براہِ راست جاوید سے بات کریں''۔

وہ ریسیور کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ بہن کا رشتہ کرنے سے انکار کروں گا تو انسپکٹر جاوید دشمن بن جائے گا اور فون پر بات نہ کرنے سے میری نفرت اور دشمنی ظاہر ہوگی''۔

اس نے آگے بڑھ کر نورین سے ریسیور لیا۔ ریسیور کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو! میں اقبال امام بول رہا ہوں''۔

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ ہم سب تجسس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''مسٹر جاوید! میں کس طرح تعاون کروں گا؟''

وہ پھر خاموش رہ کر جاوید ظفر کی باتیں سننے لگا۔ ''ہوں...... ہوں...... ہاں...... ہاں'' کرنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ابھی اپنے والدین سے مشورہ کر رہا ہوں۔ پھر میرے والدین تمہارے والدین سے گفتگو کریں گے''۔

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ سر گھماتے ہوئے نورین کو گھور کر دیکھا پھر کہا۔ ''آج تک کسی دشمن نے ایسی دشمنی نہیں کی ہوگی، جیسی اس بہن نے کی ہے''۔

شباہت نے پوچھا۔ ''وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''ابھی تو یقین دلا رہا ہے کہ نورین کی خاطر میری کمائی میں سے حصہ نہیں لے گا لیکن شرط یہ بھی ہے کہ میں اس سے تعاون کروں گا۔ میرے جیسے عہدے دار جو ٹیکس چوری کرنے والوں سے لاکھوں روپے کماتے ہیں اور ٹیکس چوروں کی فائلیں دبائے رکھتے ہیں، میں ان پوشیدہ فائلوں کی نشاندہی کروں گا تو انسپکٹر جاوید میری اندھی کمائی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیا کرے گا۔ وہ دوسرے عہدیداراں سے حصہ وصول کیا کرے گا۔ اس طرح اس کا بھلا ہوگا اور میں محفوظ رہوں گا''۔

میں نے کہا۔ ''اقبال! اگرچہ تمہیں انسپکٹر جاوید سے تعاون کرنا ہوگا لیکن انسپکٹر جاوید کی دوستی اور رشتے داری سے تم ہمیشہ محفوظ اور مطمئن رہا کرو گے''۔

''پہلے ہی پولیس اور سی آئی اے کے دو افراد مجھے تحفظ دیتے اور کمیشن لیتے آ رہے ہیں۔ انسپکٹر جاوید مدد کے لیے ضروری نہیں تھا لیکن ایسی دشمن بہن کی حماقت سے وہ میرے اعصاب پر سوار رہا کرے گا''۔

اس نے ناگواری سے نورین کو دیکھا، پھر کہا۔ ''میری طرف سے انکار نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں، جاوید کے بزرگوں سے بات کریں اور رشتہ طے کر دیں''۔

وہ مجبوراً اس رشتے سے رضامندی ظاہر کر کے چلا گیا۔ ماں بھی بیٹے کے پیچھے چلی گئی۔ اس رشتے سے پہلے ہی انسپکٹر جاوید گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا تھا۔ ہڈی گلے میں پھنسنے کے بعد باہر نہیں نکلتی۔ اسے نگلنا پڑتا ہے لیکن نگلنے کے بعد وہ اندر جا کر چبھتی رہتی ہے۔ وہ بھی چبھنے کے لیے آ رہا تھا۔

میری بیٹی نے اس سے اپنا مستقبل وابستہ کرلیا تھا لیکن بھائی کی ترقی کی راہوں میں دور تک کانٹے بچھادیے تھے۔ ایک غیر کو اپنا بنا کر ہمارے اندرونی معاملات کا رازدار بنا رہی تھی۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں بیٹی کی پسند کو بالائے طاق رکھ کر رشتے سے انکار کردیتا لیکن نتیجہ برا ہوتا۔ کوئی ایک اٹل فیصلہ کرنا تھا۔ اسے داماد بنانا تھا یا دشمن بنانا تھا۔

● ● ●

میں نے دوسرے دن فون پر جاوید ظفر کے والدین سے گفتگو کی۔ جاوید کو داماد بنانے پر راضی ہو کر کہا۔ ''کل عام تعطیل ہے۔ آپ آئیں اور نکاح پڑھانے کے لیے کوئی قریبی تاریخ مقرر کرلیں۔ شادی نہایت سادگی سے ہوگی''۔

ماں کے دل میں بیٹی کو دلہن بنانے کے ہزاروں ارمان ہوتے ہیں لیکن شباہت بیٹے کو اعصابی مریض بنانے کے لیے جشن نہیں منا سکتی تھی۔ ہم نے چند گنے چنے عزیز واقارب کو مدعو کیا۔ محمد علی اسلام آباد سے بہن کی شادی کے لیے پانچ لاکھ روپے اور باڑہ مارکیٹ سے قیمتی سامان لے کر آیا۔ تعجب سے بولا۔ ''امی! یہ کیا......؟ میری ایک ہی بہن ہے۔ مگر گھر میں خاموشی ہے۔ نہ ڈھولک بج رہی ہے، نہ سہاگ کے گیت گائے جارہے ہیں۔ گھر کو اندر اور باہر سے سجانا چاہئے۔ عورتوں اور بچوں کی چہل پہل ہونی چاہئے''۔

میرے بھائی جان کے بیوی بچے اور سسرالی رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ میں کھل کر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ان کے سامنے اتنا کہا کہ میں سادگی پسند ہوں۔ میں نے زلیخا کو سادگی سے دلہن بنا کر رخصت کیا تھا۔ نورین کو بھی اسی طرح رخصت کروں گا۔

محمد علی نے گھر کو سجانے اور ذرا دھوم دھام کرنے کی ضد کی مگر میں نے سختی سے منع کردیا۔ میرے اور شباہت کے مخالفانہ رویے سے نورین روتی ہوئی دلہن بن کر سسرال چلی گئی۔ دوسرے دن تمام رشتے دار اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ تب محمد علی غصے سے پھٹ پڑا۔ کہنے لگا۔ ''ابو! یہ شادی......کی گئی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے امی اور آپ کے سروں پر تلوار لٹک رہی ہے اور آپ بیٹی کو سہاگن بنا کر رخصت کرنے کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ بھائی جان تو ایسے دور دور رہے جیسے میری بہن سے ان کا کوئی رشتہ نہ ہو''۔

شباہت نے کہا۔ ''رشتہ تو ہے مگر تمہارا بہنوئی ہمیشہ ننگی تلوار کی طرح اقبال کے سر پر لٹکتا رہے گا''۔

میں نے محمد علی کو اپنے پاس بٹھا کر سہولت سے تمام حقائق بیان کیے لیکن محمد علی نے کہا۔ ''میرا بہنوئی آئندہ اعصاب پر سوار رہے گا یا نہیں؟ یہ بہنوئی اور بڑے سالے صاحب کا معاملہ ہے لیکن آپ لوگوں نے ٹیکس چوری کرانے والے بیٹے کی ہمدردی میں معصوم بیٹی کا دل توڑ کر اسے رلاتے ہوئے رخصت کیا ہے اور اس طرح ماں باپ ہونے کا فرض خواب ادا کیا ہے''۔

اقبال نے غصے سے کہا۔ ''بکواس مت کرو۔ مجھے ٹیکس چوری کرانے والا کہہ رہے ہو، میں تمہارا منہ توڑ دوں گا''۔

محمد علی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ''آؤ، ہمت ہے تو مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ''۔

شباہت دونوں بیٹوں کے درمیان آ کر بولی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ بھائی ہو کر آپس میں لڑ رہے ہو''۔

''امی! آپ ہٹ جائیں۔ یہ بڑے بھائی صاحب شہ زور ہو سکتے ہیں لیکن ایک بات جانتا ہوں، چور پر الزام آئے تو وہ حملہ

نہیں کرتا۔ ڈر کر چھپتا ہے۔ اپنی خیر منانے کی فکر کرتا ہے''۔

میں نے ڈانٹ کر کہا۔''خاموش ہو جاؤ۔ بار بار بھائی کو چور کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اسی بھائی سے خون کا رشتہ ہے''۔

وہ بولا۔''ہم سب کو شرم نہیں آنی چاہئے۔ آپ نے تعلیم دی تھی کہ ہمیں وقت، حالات اور زمانے کے تیور دیکھ کر اپنے تیور بدلتے رہنا چاہئیں۔ میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ اسلام آباد میں اب وہ پہلے والا گیراج صرف گیراج اور کارخانہ ہی نہیں ہے۔ میں نے گاڑیوں کا بہت بڑا شو روم بھی بنا لیا ہے۔ نئی اور پرانی کے علاوہ مسروقہ گاڑیوں کے لین دین سے لاکھوں روپے کماتا ہوں۔ میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر کہہ رہا ہوں کہ بھائی جان کی طرح میں بھی چور ہوں۔ آپ بھی فراخ دلی سے تسلیم کریں کہ چوروں کے ماں باپ ہیں''۔

میں نے اور شباہت نے جھینپ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس نے کہا۔''چوروں کے دلوں میں بھی ایمان کی لو بھڑکتی ہے۔ اگرچہ وہ بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔ مگر بھڑکتی ضرور ہے۔ اگر آپ سب کے دلوں میں کبھی یہ لو بھڑک جائے تو ندامت سے سر جھکا لیں۔ آپ کی ایک بیٹی، ہماری ایک بہن چور نہیں ہے، معصوم ہے لیکن آپ لوگوں نے اسے سزا یافتہ دلہن بنا کر میکے سے رخصت کیا ہے''۔

میں کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر دکان میں چلا آیا۔ میں آنکھوں والا اندھا ہوں۔ مجھے کبھی ڈھنگ کا رستہ سجھائی نہیں دیا۔ اپنی جوانی کی ابتدا اور قیام پاکستان کے پہلے دن سے نیکی، شرافت اور قانون پسند شہری کی حیثیت سے ایک سیدھی سادی سی زندگی گزارتا رہا۔ ایسی شرافت اور سادگی کے صلے میں شبو کو اور شبو سے ہونے والی بیٹی زلیخا کو رسی کے پھندوں پر ہار گیا۔ اپنے داماد سلام بھٹی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے۔ تب عقل نے سمجھایا، گرمی کے موسم میں ایک بنیان اور شلوار پہنتا ہوں۔ سردی کے موسم میں گرم کپڑے پہنتا ہوں۔ گرمی میں شربت پیتا ہوں، سردی میں کافی پیتا ہوں۔ جب موسم کے حساب سے کھانا پینا بدلتا ہوں تو حالات کے مطابق خود کو کیوں نہیں بدلتا؟

زندگی کو وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق گزارنا چاہئے۔ میں نہ گزار سکا۔ میرے بچوں کو ہر لحہ بدلتے ہوئے وقت کا نباض بننا چاہئے اور وہ ایسے بن چکے تھے۔

میرے دونوں بیٹے دوسروں سے نیکیاں کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ کیونکہ مسلمان ہیں۔ میرے بیٹے ٹیکس چوروں سے تعاون کرتے ہیں، ان کے کالے دھن میں اضافہ کرتے ہیں۔ مسروقہ اور چھینی ہوئی گاڑیاں فروخت کرتے ہیں۔ کیونکہ حالات کہتے ہیں، دولت زیادہ سے زیادہ حاصل کرو۔ دولت ہوگی تو طاقت ہوگی۔ طاقت ہوگی تو پھر میرے گھر کی کوئی زلیخا، کوئی داماد بے موت نہیں مارا جائے گا۔

اور میں دیکھ رہا تھا کہ میرے بچے غنڈوں، دہشت گردوں اور سیاسی طرز کے مظالم سے محفوظ تھے۔ ہماری عالی شان کوٹھی تیار ہو چکی تھی۔ ہماری زندگی کا معیار بدل چکا تھا۔ اقبال کی اپنی بیس لاکھ روپے کی ہنڈا اکارڈ تھی۔ میرے اور شباہت کے لیے ایک ٹویوٹا کرولا تھی۔ مخصوص غنڈے اور پولیس والے مقررہ وقت پر آتے تھے اور بھتا لے کر چلے جاتے تھے۔ ہم نے حکمرانوں سے یہ سبق سیکھا تھا کہ جس کے پیچھے غنڈوں اور پولیس والوں کی طاقت ہو، اس سے موت بھی دور بھاگتی ہے۔ طبعی عمر تک سلامتی کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔

صرف ایک میرا داماد انسپکٹر جاوید پہلے دن سے کھٹک رہا تھا۔ اقبال نے یہ طے کیا تھا کہ جاوید سے تعاون بھی کرے گا اور اسے زیادہ

عرصے تک اپنے سر پر مسلط رہنے کا موقع بھی نہیں دے گا۔

انکم ٹیکس کے شعبے میں ایک دوسرا عہدے دار دوسرے ٹیکس چوروں کا معاون تھا۔اقبال دفتر کے اندرونی معاملات کی پوری خبر رکھتا تھا۔اس نے دوسرے عہدے دار کے خلاف مخبری کی۔انسپکٹر جاوید کو بتایا کہ کروڑوں روپے کے ٹیکس کی فائلیں کس طرح دبائی گئی ہیں اور کہاں چھپائی گئی ہیں؟

انسپکٹر جاوید نے ایک مجسٹریٹ کی سرپرستی میں چھاپا مارا اور تمام پوشیدہ فائلوں کو قبضے میں لے کر اس عہدے دار اور ٹیکس چوروں کے خلاف مقدمہ بنا دیا۔

اقبال نے اس میدان میں بڑی چالبازیاں سیکھی تھیں۔جب نورین اور جاوید کے رشتے کی بات چلی تھی، تب ہی اس نے جاوید کے بارے میں معلوم کیا تھا کہ وہ ایک ایماندار، دیانتدار اور فرض شناس پولیس انسپکٹر ہے۔

جاوید اقبال نے کہا تھا۔"میں مجرموں کو معاف نہیں کرتا۔آپ کو اس وقت تک نظر انداز کرتا رہوں گا، جب تک آپ اپنے شعبے کے ایک ایک ٹیکس چور کی نشاندہی ثبوت کے ساتھ کرتے رہیں گے۔آپ نورین کے بڑے بھائی ہیں۔آپ کے تعاون سے دوسرے عہدے دار گرفت میں آتے رہیں، تب تک آپ اپنی مجرمانہ ذہنیت کو بدل لیں۔اپنے دفتری فرائض دیانت داری سے انجام دینے کے عادی ہو جائیں"۔

اقبال نے سمجھ لیا تھا کہ وہ جب تک اپنے دوسرے عہدے دار ساتھیوں کو جاوید کے حوالے کرتا رہے گا، اس وقت تک خود محفوظ رہے گا لیکن اپنے ہی ساتھیوں کی مخبری کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ٹیکس چور اقبال سے بھی دور بھاگنے لگتے۔اس کی اپنی آمدنی کے ذرائع ختم ہونے لگتے۔انسپکٹر جاوید کہہ چکا تھا کہ اقبال کو آئندہ آمدنی کے ناجائز ذرائع ختم کر کے دیانت داری سے دفتری فرائض ادا کرنے ہوں گے۔

بھلا بے حساب آمدنی کے ذرائع کون ختم کرتا ہے۔اقبال پولیس اور سی آئی اے کے اعلیٰ افسروں کو کمیشن دیا کرتا تھا۔اس کی پہنچ اوپر تک تھی۔پھر ایک عہدے دار کے گرفتار ہونے سے پر اس شعبے سے اور پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والے بیوروکریٹ سراپا احتجاج بن گئے۔ بیوروکریٹ جب بولتے ہیں تو کفن پھاڑ کر بولتے ہیں اور اپنے خلاف قانونی کارروائی کرنے والوں کو کفن کے بغیر قبر میں پہنچا دیتے ہیں۔

ان کے احتجاج کے نتیجے میں جو عہدے دار گرفتار ہوا تھا، اسے بے گناہ اور دیانت دار ثابت کر دیا گیا۔جو فائلیں قبضے میں لی گئی تھیں، ان پر مٹی ڈال دی گئی اور انسپکٹر جاوید کو دوسرے صوبے کے ایک چھوٹے سے شہر میں ٹرانسفر کرا دیا گیا۔یہ فرض شناسی کی بہت بڑی سزا تھی۔کہاں لاہور اور کہاں ایک دور افتادہ چھوٹا شہر، جہاں وہ نورین کے ساتھ پہنچ کر زندگی کی بہترین سہولتوں سے محروم ہو گیا تھا۔

نورین نے لاہور سے جاتے وقت مجھ سے اور شباہت سے کہا تھا۔"میں اس عالی شان کوٹھی میں رفتہ رفتہ بیوروکریٹ بننے والے مسٹر اقبال امام کی امی اور ابو سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ میں اپنے میکے کی کیچڑ میں بھی کنول رہی تھی اور اب اپنے فرض شناس شوہر جاوید کے ساتھ ایک پسماندہ شہر میں رہ کر اللہ کی رضا پر راضی رہوں گی"۔

پھر وہ روکنے کے باوجود ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رکی۔منہ پھیر کر ایسے گئی کہ پھر کبھی ماں باپ کو سلام کرنے نہیں آئی۔ویسے اس کی

اس بات سے میرے علم میں اضافہ ہوا کہ اقبال امام جیسے سرکاری عہدے دار، بیوروکریٹ کیسے بنتے ہیں؟ جو حکومت کے اور حکمرانوں کے اہم راز جانتا ہے اور انہیں اہم معاملات میں بلیک میل کرتا ہے۔ ملک اور قوم کے نقصان پر فائدے اٹھاتا ہے، وہ بیوروکریٹ کہلاتا ہے۔ اقبال امام ان ٹیکس چوروں کا راز دار تھا جو حکومت کے ذریعے بے حد وحساب جائیداد بناتے تھے۔ کروڑوں اور اربوں روپے کی جائیداد پر جو ٹیکس لگتا تھا، اقبال اس ٹیکس کی ادائیگی سے انہیں بچاتا تھا اس طرح اس سے اچھی خاصی رقم بھی لیتا تھا۔ ان کی خفیہ جائیداد اور کالے دھن کا راز دار بھی بن کر رہتا تھا۔

● ● ●

میں نے چند ماہ بعد اخبارات میں پڑھا کہ ہمارے ملک میں پندرہ بیس کھرب کے درمیان کالے دھن کا کاروبار چل رہا ہے۔ یہ کالا دھن ٹیکس چوری کی مختلف صورتوں سے تشکیل پا رہا ہے۔

میں نے اخبار کو ایک طرف پھینک دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ اخبار مجھے پتھر مار رہا ہے۔ میرے بیٹے محمد علی نے کہا تھا، چوروں کا ضمیر بھی جاگتا ہے۔ خواہ تھوڑی دیر کے لیے جاگے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اتنے وسیع پیمانے پر ٹیکس چوری کے باعث ملک کی معیشت بری طرح تباہ ہو رہی ہے۔

یہ جاننے کے باوجود میں نے دل کو سمجھایا۔ صرف میرا بیٹا ہی ایسا نہیں کر رہا ہے۔ سب ایسا کر رہے ہیں اور ہم ایسا نہ کریں تو کیا کریں؟ کس طرح کی زندگی گزاریں؟ ہمیں تو حالات کی ستم ظریفی نے اسے راستے پر ڈالا ہے۔

اب ہم یہ نہیں سوچتے تھے کہ زندگی گزارنے کے لیے دنیاوی معاملات میں ایماندار رہنا ہے، یہ بعد میں سوچنے کی بات تھی۔ پہلے اپنی اور اپنی اولاد کی سلامتی کے راستے پر چلنا تھا۔ میں بیوی، بیٹی اور داماد کو قتل گاہوں میں چھوڑ کر موجودہ راستے پر آیا تھا۔ میں قتل گاہ کی طرف جانے والے راستے پر اپنے بچوں کو نہیں لے جا سکتا تھا۔ اب اگر کہیں سے عزت اور جان و مال کی سلامتی کی ضمانت ملے تو میں بھی میرے بیٹے اپنی روش نہیں چھوڑیں گے۔ دولت مند بننے کے لیے اندھی کمائی کا چسکا پڑ جائے تو اولاد نصیحت کرنے والے والدین کو چھوڑ دیتی ہے۔ مگر۔ ''کھل جا سم سم'' پڑھنا نہیں چھوڑتی۔

ایک روز شباہت نے کہا۔'' بچے جوان ہو جائیں۔ دونوں ہاتھوں سے کمانے لگیں تو بے مروت ہو جاتے ہیں۔ محمد علی تین برسوں سے اسلام آباد میں ہے۔ ہر مہینے ہم سے ملنے آتا ہے لیکن کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم اس کے پاس اسلام آباد آ جائیں''۔

''میں نے اس سے کہا تھا کہ وہاں اس کے پاس آؤں گا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے لیے کوٹھی بنا رہا ہے۔ وہ بن جائے گی تو ہمیں بلائے گا''۔

''میں بھی کہہ رہی تھی۔ اسے پکانے کھانے کی تکلیف ہوتی ہو گی یا وہ ہوٹلوں میں کھاتا ہو گا۔ میں وہاں کچھ روز رہ کر اپنے ہاتھوں کا پکوان کھلاؤں لیکن اس نے کہا، جس دوست کی ماں کا گیراج ہے، اسی کی کوٹھی میں رہتا ہے۔ وہیں کھاتا ہے۔ اب میں آپ کے ساتھ وہاں جاؤں گی تو اس خاتون پر ہم بوجھ بن جائیں گے۔ وہ خاتون بوجھ نہ سمجھیں لیکن ہمارا جانا مناسب نہیں ہے''۔

اقبال نے کہا۔'' آپ کا وہ چھوٹا فراڈ ہے۔ بڑی ڈینگیں مار کر گیا تھا کہ لاکھوں کماتا ہے۔ جب اتنا کماتا ہے تو کیا اس نے تین برسوں میں اپنا ایک مکان نہیں بنایا ہوگا۔ اگر نہ بنایا ہوتب بھی کرائے کے مکان میں اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ کو بلا سکتا ہے''۔

میں نے کہا۔'' میرا جی چاہتا ہے، وہاں جاؤں، ایک کمانے والے بیٹے کو یہاں پھلتا پھولتا دیکھ رہا ہوں، وہاں بھی اسے دیکھ کر اطمینان کروں کہ وہ اقبال کی طرح کامیاب زندگی گزار رہا ہے''۔

'' سچ تو یہ ہے کہ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں، اقبال کو چھوڑ کر جاؤں گی تو پتا نہیں کتنے دنوں میں واپسی ہوگی۔ یہ یہاں اکیلا رہ جائے گا''۔

'' کیا میں اکیلا نہیں رہ سکتا؟ آپ تو مجھے بچہ ہی سمجھتی ہیں''۔

'' جب تک شادی نہیں کرو گے، تمہیں بچہ سمجھ کر ہی دیکھ بھال کرتی رہوں گی''۔

'' اچھا دیکھیں، کل اتوار کی چھٹی ہے۔ آپ دونوں آج رات میری کار میں چلیں۔ صبح اسلام آباد پہنچیں گے۔ پھر محمد علی سے مل کر شام کو واپس آ جائیں گے''۔

وہ ہمارے دل کی بات کہہ رہا تھا۔ ہم اسی رات کار میں چل پڑے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کتنے برسوں کے بعد لاہور سے باہر نکلا تھا۔ موٹروے کے کشادہ اور شیشے جیسے صاف ستھرے راستے پر سفر کرتے وقت سمجھ میں آیا کہ میں ایک غریب اور قرض میں ڈوبے ہوئے ملک کی شاہراہ پر سفر نہیں کر رہا ہوں۔ ایک نہایت ترقی یافتہ ملک میں ہوں۔ کچھ دیر کے لیے سہی، مجھے یہ فریب اچھا لگا۔ میں اپنی زندگی میں بھی فریب کھا رہا تھا کہ میری اولاد خوب ترقی کر رہی ہے۔

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشانیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اوراَن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آرہا ھے۔**

ہم صبح اسلام آباد پہنچے۔ محمد علی کے شوروم اور گیراج کا پتا معلوم تھا۔ وہاں چوکیدار سے اس کی رہائش کا پتا معلوم ہوا۔ ہم وہاں پہنچے۔ وہ بہت ہی شاندار کوٹھی تھی۔ ملازم نے اندر جا کر خبر دی کہ اس کے ماں باپ آئے ہیں۔ وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔ حیرانی اور پریشانی سے بولا۔ ''آ...... آپ...... اچانک کیسے آ گئے؟ مجھے اطلاع دی ہوتی......''

اقبال نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''ہم تمہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ تمہارا حیران ہونا فطری ہے لیکن تم تو پریشان بھی ہو رہے ہو۔ اتنے پریشان کہ بزرگوں کو سلام کرنا بھی بھول گئے''۔

اس نے فوراً ہی سلام کیا پھر کہا۔ ''آیئے، اندر آیئے''۔

ہم اس کے ساتھ اندر آ گئے۔ شباہت نے پوچھا۔ ''تمہارے دوست کی ماں یہاں رہتی ہے؟ یہ اسی کی کوٹھی ہے؟''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے اقبال نے کہا۔ ''انہی خاتون کی کوٹھی ہے۔ وہ دیکھیں، دیوار پر بڑی سی تصویر ہے۔ شاید یہ وہی خاتون ہیں''۔

میں نے محمد علی سے پوچھا۔ ''کیوں بیٹے! یہی تمہارے مرحوم دوست کی والدہ ہیں؟ ان کا نام تم نے کبھی نہیں بتایا؟''

''وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ ''رئیسہ خاتون، یہ...... یہ بہت اچھی ہیں۔ مجھے اس مقام پر انہوں نے پہنچایا ہے۔ یوں سمجھیں کہ ان کے شوروم اور گیراج کا مالک میں ہوں۔ کیونکہ ان کا کاروبار سنبھالنے والا میرے سوا کوئی نہیں ہے''۔

شباہت اور اقبال صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ میں تصویر کے پاس آ کر رئیسہ خاتون کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاصی پختہ عمر کی خاتون تھی۔ تقریباً شباہت کی ہم عمر ہو گی۔ میں نے پوچھا۔ ''بیٹے! کیا یہ خاتون سو رہی ہیں؟''

صبح کے آٹھ بجے تھے۔ میں نے سوچا، دولت مند خاتون ہیں، دیر تک سونے کی عادی ہو گی۔ محمد علی نے کہا۔ ''یہ یہاں نہیں ہیں، ہسپتال میں ہیں......''

وہ آگے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ رُک کر ایک دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دور کسی کمرے سے بچے کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شباہت نے پوچھا۔ ''بچہ رو رہا ہے۔ کیا یہاں فیملی کے دوسرے افراد بھی ہیں؟''

''نہیں، رئیسہ خاتون کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے، رشتے دار تو ہیں لیکن رئیسہ انسے دور کی صاحب سلامت رکھتی ہیں''۔

''پھر یہ کس کا بچہ رو رہا ہے؟''

''جی...... یہ...... یہ میرا ہے''۔

''کیا؟ کیا تمہارا بچہ ہے؟''

''جی امی! وہ...... وہ آپ کا پوتا رو رہا ہے''۔

شباہت صوفے سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اقبال نے پوچھا۔ ''تمہارا بچہ! یعنی کہ تم شادی کر چکے ہیں؟

لیکن شادی کب ہوئی؟ بچہ کب ہوا؟ بچے کا مطلب ہے...... شادی کو سال گزرا ہوگا اور تم نے اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کیا؟''

میں نے پوچھا۔''تم نے اپنی شادی ہم سے کیوں چھپائی؟''

شباہت تڑپ کر بولی۔''پوتا رو رو کر بے حال ہو رہا ہے اور آپ جرح کر رہے ہیں۔ اسے چھوٹے! کہاں ہے وہ؟ اسے سنبھالتا کیوں نہیں؟ اسے یہاں لاتا کیوں نہیں؟ مجھے وہاں کیوں نہیں لے کر جاتا؟''

وہ بڑے دکھ اور بڑے مسرتوں سے رونے لگی۔ اسی وقت ایک آیا بچے کو گود میں لیے دروازہ کھول کر اندر آئی۔ محمد علی سے بولی۔

''صاحب جی! بابا آپ سے ہی مانتا ہے۔ ہم سے نہیں سنبھلتا''۔

شباہت نے تیزی سے آگے بڑھ کر آیا سے چھیننے کے انداز میں بچے کو لیا۔ پھر بے اختیار اسے چومنے لگی۔ اسے سینے سے لگا کر رونے لگی۔''ہائے میرے نصیب، میں دونوں بیٹوں سے شادی کے لیے کہتی رہی۔ ایک پوتے اور پوتی کے لیے ترستی رہی۔ چھوٹے! تجھ سے خدا سمجھے۔ میرا پوتا پیدا ہوا، اتنا بڑا ہو گیا اور تُو نے اسے میری گود میں لا کر نہیں ڈالا''۔

خدا کی قدرت، بچہ شباہت کی گود میں آتے ہی چپ ہو گیا تھا۔ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے چوم کر رونا بھول گئی۔ ہنستی ہوئی مجھ سے بولی۔''دیکھیں۔ آپ اس شریر کو دیکھ رہے ہیں، گود میں آتے ہی دادی کو پہچان گیا''۔

میں نے ناراضگی سے محمد علی کو دیکھا پھر اس سے کہا۔''تم اس ماں کے بیٹے ہو، اس کی ممتا کی دیوانگی کو سمجھ رہے ہو؟ یہ ان لمحات میں تمہارے بچپن کو گود میں اٹھائے ہوئے ہے''۔

محمد علی نے آگے بڑھ کر ماں سے لپٹ کر کہا۔''امی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ سے اتنی بڑی بات چھپائی۔ مگر میرا دل کہتا تھا، آپ پوتے کو دیکھتے ہی میری غلطیوں کو معاف کر دیں گی''۔

میں نے پوچھا۔''لیکن تم نے چھپ کر شادی کیوں کی؟ ہماری بہو کہاں ہے؟''

ایک ملازم ناشتے اور لسی سے بھرے ہوئے گلاسوں کی ٹرالی دھکیلتا ہوا لایا۔ محمد علی جواب دینے سے ہچکچا رہا تھا۔ اس نے کہا۔''آپ رات بھر کے سفر کے تھکے ہوئے ہوں گے۔ کچھ کھا لیں۔ نیند پوری کریں، پھر باتیں ہوں گی''۔

''پہلے میری بات کا جواب دو۔ تم نے شادی کی ہے یا کوئی جرم کیا ہے؟ ہمیں اپنی پسند بتا کر شادی کرتے تو کیا ہم کوئی اعتراض کرتے؟''

اس نے جھجکتے ہوئے ماں کو دیکھا، شباہت نے کہا۔''چپ کیوں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟''

اقبال نے پوچھا۔''چھوٹے! بات کیا ہے؟''

وہ ماں کے سامنے سر جھکا کر بولا۔''وہ...... امی! بات یہ ہے کہ میں شادی کی بات کرتا تو......''

شباہت نے پوچھا۔''تو......؟''

''آ......آپ اور......اور ابو بہو کو کبھی پسند نہ کرتے''۔

''کیوں پسند نہ کرتے؟ کیا وہ بدصورت ہے؟ اس میں کوئی عیب ہے؟ یا وہ ایسے ویسے خاندان کی لڑکی ہے؟''

''لڑکی نہیں ہے، میرے مرحوم دوست کی ماں ہے''۔

مجھے جیسے کھڑے کھڑے بجلی کا جھٹکا لگا۔ میں سہارے کے لیے اس دیوار سے لگ گیا جہاں رئیسہ خاتون کی بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ شباہت کے پیچھے صوفہ نہ ہوتا تو وہ پوتے سمیت فرش پر گر پڑتی۔ اقبال صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا، پھر بولا۔ ''چھوٹے! وہ جو تصویر والی ہے، تُو نے اس سے شادی کی ہے؟''

محمد علی چپ تھا۔ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اقبال نے کہا۔ ''ابو! میں نے تین برس پہلے کہا تھا اور آپ لوگوں نے مجھے جھوٹا سمجھا تھا۔ یہ انارکلی میں اسی عورت کے پیچھے دُم ہلاتا پھر رہا تھا''۔

''بھائی جان! زبان کو قابو میں رکھیں۔ نہ یہ میری مالکہ ہے نہ میں اس کے پیچھے غلام بن کر رہتا ہوں۔ یہ میری منکوحہ ہے۔ ہمارے درمیان سمجھوتا ہوا ہے۔ اسے کاروبار سنبھالنے کے لیے میری اور مجھے دولت حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی''۔

''تم نے دولت حاصل کرنے کے لیے ایک بوڑھی عورت سے، اپنے دوست کی ماں سے شادی کی؟''

''میں نے شادی کی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ میں اپنی توقع سے زیادہ دولت حاصل کر رہا ہوں لیکن اس عورت کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ آپ تو دولت حاصل کرنے کے لیے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ آپ ٹیکس چوروں کے ذریعے جس طرح ملک کو معاشی اور اقتصادی طور پر بدحال بنا رہے ہیں، یہ جرم ناقابلِ معافی ہے۔ آپ میرا کوئی جرم بتا دیں؟''

وہ غصے سے بولا۔ ''امی میں آپ کے ساتھ اس لیے نہیں آیا ہوں کہ یہ مجھ پر کیچڑ اچھالے، میں جا رہا ہوں۔ کیا آپ میرے ساتھ چل رہی ہیں؟''

وہ اٹھ کر اقبال کے پاس آئی۔ اسے پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ غصہ دکھانے کا وقت نہیں ہے۔ تم بیٹھو، میں اس سے بات کرتی ہوں''۔

پھر اس نے محمد علی سے کہا۔ ''بڑے بھائی کو مجرم کہنے سے تمہاری غلطیوں پر پردہ نہیں پڑے گا۔ یہ جو اتنی بڑی سی تصویر لگا رکھی ہے، یہ عورت تمہاری ماں کے برابر ہے''۔

''پلیز امی! جو میری شریکِ حیات ہے، اس کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔ میں نے تہذیب اور اخلاق کے منافی کوئی کام نہیں کیا۔ شریعت کے مطابق رئیسہ سے نکاح پڑھایا ہے۔ آپ سے اور ابو سے یہ بات چھپاتا رہا۔ اس کشمکش میں رہا کہ آپ دونوں عمر رسیدہ بہو کو تسلیم کریں گے یا نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''شباہت! تمہاری گود میں جو پوتا ہے، وہ تمہارے بیٹے کی منکوحہ کا ہے۔ شریعت کے مطابق وہ بیٹے کی بیوی اور ہماری بہو

ہے۔اپنے پوتے کی خاطر اس کی عمر کو نظر انداز کرو۔اس بہو کو دیکھ کر ہمیں دکھ ہوتا رہے گا۔مگر سچ کو تو دیکھتے ہی رہنا ہوگا''۔

''چھوٹے نے الجھن میں ڈال دیا ہے۔میں اپنی ہم عمر بہو سے ملنا نہیں چاہوں گی اور پوتے کو بھی چھوڑ نہیں سکوں گی۔نہ یہ کر سکتی ہوں، نہ وہ کر سکتی ہوں۔میں کیا کروں، میں کیا کروں؟''

وہ رونے لگی۔میں نے بیٹے سے پوچھا۔''رئیسہ کہاں ہے؟''

''ہسپتال میں ہے۔ماں بننے والی ہے''۔

شباہت نے چونک کر بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔''ہسپتال میں ہے؟ماں بننے والی ہے؟میرا ایک اور پوتا یا پوتی ہوگی۔یا اللہ!جو ہو، خیر خیریت سے ہو۔ایسے وقت مجھے بہو کے پاس رہنا چاہئے۔مگر کس بہو کے پاس رہوں؟''

وہ پھر رونے لگی۔میں نے پوچھا۔''کیا رو رو کر جان دے دوگی۔جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔تمہارے رونے سے بہو زلیخا کی طرح بوڑھی سے جوان نہیں ہو جائے گی۔آنسو بہانا بند کرو۔حالات سے سمجھوتا کرو۔جو پیش آرہا ہے، اسے قبول کرو''۔

میں نے شباہت سے اپنے پوتے کو لے کر چوما۔اسے سینے سے لگایا۔فون کی گھنٹی بجنے لگی۔محمد علی نے ریسیور اٹھا کر دوسری طرف کی بات سنی، پھر کہا۔''میں ابھی آرہا ہوں''۔

وہ ریسیور رکھ کر بولا۔''آیئے، میں آپ سب کو الگ الگ بیڈ روم دکھاتا ہوں۔آپ آرام کریں۔اعلیٰ حاکم کے محل میں میری ڈیوٹی ہے۔میں دو چار گھنٹے میں واپس آجاؤں گا''۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔''کیا تم محل میں ملازم ہو؟تمہارا تو اپنا لاکھوں روپے کا کاروبار ہے؟''

''میں باقاعدہ ملازم نہیں ہوں۔دراصل اعلیٰ حاکم کے پروٹوکول کے لیے کاریں، جیپ اور پجیرو جیسی پچاس عدد گاڑیاں ہیں، جن کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کا ٹھیکا مجھے دیا گیا ہے۔میرے گیراج کے ملازم محل کی ان گاڑیوں کو ہمیشہ آرڈر میں رکھتے ہیں۔میں ابھی سپر وائزنگ کے لیے جا رہا ہوں۔واپسی میں ہسپتال جاؤں گا''۔

پھر وہ جھجکتے ہوئے بولا۔''امی!وہ ہسپتال میں ہے۔یہ آپ کے بیٹے کا گھر ہے۔آپ سے التجا کرتا ہوں، اپنے پوتے کی اور اس گھر کی ذمے داریاں سنبھال لیں''۔

وہ تو پوتے کو اب چھوڑ نہیں سکتی تھی۔گھر بھی بیٹے کا تھا۔وہاں رہنے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔اقبال نے کہا۔''امی!آپ کو یہاں رکنا چاہئے، میں آپ کی ممتا اور جذبات کو سمجھتا ہوں۔یہاں رہنا آپ کا فرض بھی ہے۔مجھے جانے کی اجازت دیں''۔

محمد علی فوراً ہی اقبال کے پاس آکر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''ہم ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔پھر بھی بھائی ہیں۔پہلی بار میرے گھر آئے ہیں۔میں امی کا واسطہ دیتا ہوں، اس طرح نہ جائیں''۔

اقبال نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''اتنی محبت سے بول رہے ہو۔میں رک جاتا ہوں مگر پہلے مجھے یقین ہونا چاہئے کہ یہ تمہارا

اپنا گھر ہے"۔

"کل بینک کھلے گا۔ میں لاکر سے دستاویزات لاکر دکھاؤں گا۔ یہ کوٹھی اور تمام کاروبار سب میرے نام ہے۔ میں آپ کا بھائی ہوں۔ میں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا ہے"۔

دونوں بھائی مسکرانے لگے۔ دونوں کے ہونٹوں پر دولت کمانے والی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اقبال نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کل دفتر سے چھٹی کروں گا، تمہارے پاس رہوں گا"۔

ہم پہلی بار دونوں بھائیوں کا پیار دیکھ رہے تھے، ایک عمر رسیدہ بہو کے تلخ وجود کو بھول گئے۔ پھر ہائی لیول پر زندگی گزارنے کا جو راستہ ہمارے بچوں نے اختیار کیا تھا، اس کے پیش نظر وہ بہو خوش قدم تھی۔ اس نے ہمارے چھوٹے کو لکھ پتی بنا دیا تھا۔

آیا بچے کے لیے فیڈر میں دودھ لے آئی۔ شباہت اسے دودھ پلانے لگی۔ ہم ناشتا کر چکے تھے۔ اس وقت صرف لسی پی۔ محمد علی نے ہمیں ایک ایک بیڈ روم میں پہنچایا پھر کہا۔ "میں لنچ سے پہلے آجاؤں گا۔ آپ نیند پوری کریں"۔

شباہت نے کہا۔ "مجھے کچن دکھاؤ۔ میں دوپہر کا کھانا تیار کروں گی"۔

"امی! آپ آرام کریں اور پوتے کو سنبھالیں۔ کھانا آپ کو تیار ملے گا"۔

وہ چلا گیا۔ میں بستر پر آکر لیٹ گیا۔ شباہت نے آیا سے تھرماس میں گرم دودھ منگوایا فیڈر اور نپل کو اچھی طرح دھلوا کر بستر کے سرہانے والی میز پر رکھا۔ پھر دروازہ بند کر کے بستر پر آگئی۔ پوتا ہمارے درمیان سو رہا تھا۔ وہ اسے چوم کر پیار سے دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھتی رہو گی، کبھی دل نہیں بھرے گا۔ ابھی تو سو جاؤ"۔

میں سو گیا لیکن نیند کی حالت میں بے چین سا رہا۔ کبھی کبھی میرے اندر یہ سوال چبھتا تھا کہ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ کیسی زندگی گزار رہا ہوں؟ اور میں سوال کے جواب میں خود سے سوال کرتا تھا، زندگی ایسے نہ گزاروں تو کیسے گزاروں؟

پاکستان کی عمر پچاس برس سے زائد ہو چکی۔ ان برسوں میں قومی سطح پر ان بنیادی اصولوں کا تعین نہیں ہو سکا کہ زندگی گزارنے کے آداب کیا ہیں؟ ایسے حالات پیدا کئے جاتے رہے کہ ہر فرد دوسروں پر برتری حاصل کرنے کے لیے غیر اخلاقی اور غیر قانونی تدابیر پر عمل کرنے لگا ہے۔ بڑی ہی سازشوں سے، بڑی ہی خفیہ ڈپلومیسی سے ذہنوں پر یہ نقش کر دیا گیا ہے کہ عزت، شہرت، شرافت اور خاندانی وقار صرف دولت مند گھرانوں کو حاصل ہے اور دولت کمتر لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ جسے حاصل ہو جاتی ہے، وہ فوراً ہی سے اچھل کر نچلی سطح کو چھوڑ کر اونچی سوسائٹی میں عزت اور خاندانی شرافت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتا ہے۔

اور میرے بیٹوں نے یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا۔ میں اخلاق اور تہذیب کے خلاف ایسی باتیں کر رہا ہوں لیکن کوئی مجھے ایسی باتیں کرنے سے روکے تو سہی۔ ہماری زندگی، ہماری طرح لاکھوں، کروڑوں افراد کی زندگی مجرمانہ ہے لیکن کوئی ہمیں شرم کیسے دلائے گا؟ ہم کروڑ دو کروڑ کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ ہمارے پاس آکر بھتا مانگنے والے ہوں، مسجد کا چندہ مانگنے والے ہوں یا فلاحی ادارے والے ہوں، سب رقم لیتے ہیں

اور ہمیں سلام کر کے جاتے ہیں۔ ہم ہنڈا اکارڈ اور پجیرو جیسی مہنگی گاڑیوں میں جاتے ہیں تو لوگ بڑی حسرت سے دیکھتے ہیں۔ نظریں ملتی ہیں تو ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہیں۔ عام لوگوں کا عمل بتاتا ہے کہ ہم عزت دار ہیں اور جب ہیں تو ہمیں شرم کون دلائے گا؟

محمد علی نے ایک بجے آ کر ہمیں جگایا۔ ہم غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں آئے تو کھانوں کی خوشبو دور سے آ رہی تھی۔ مختلف خوشبوؤں میں زعفران کی بھی خوشبو تھی۔ بڑی سی میز پر پاکستانی، ایرانی اور انگریزی کھانوں کی ڈشیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔ ''چھوٹے! اتنے اقسام کے کھانوں کی کیا ضرورت تھی۔ ہم ایک وقت میں بھلا کتنا کھا سکتے ہیں؟''

''ابو! جتنا بھی کھا سکیں، خوب کھائیں۔ بچے گا تو ملازم کھالیں گے''۔

اقبال نے کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ ''گیراج اور شوروم کا بزنس کیسا ہے؟''

''فنٹاسٹک۔ پانچوں انگلیاں گھی میں رہتی ہیں۔ مسروقہ گاڑیاں چار لاکھ پانچ لاکھ کا منافع دے جاتی ہیں۔ اعلیٰ حاکم کے محل کا ناظم سرکاری کھاتے میں نئی گاڑیوں کی خریداری لکھتا ہے لیکن پچیس تیس لاکھ کی رقم لکھ کر مجھ سے مسروقہ نئی گاڑی دس بارہ لاکھ میں لیتا ہے۔ لاکھوں روپے اس کی جیب میں جاتے ہیں اور لاکھوں میری جیب میں آتے ہیں''۔

''پھر تو بڑی زبردست دھاندلی ہوتی رہتی ہے''۔

''جی ہاں، ہر ماہ صرف گاڑیوں کی مد میں تقریباً ایک کروڑ روپے کا گھپلا ہوتا ہے۔ محل میں باوردی ملازموں کی پوری فوج ہے۔ جن کی وردیوں اور تنخواہوں پر ہی ماہانہ دس لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں''۔

شباہت نے حیرانی سے پوچھا۔ ''صرف ایک ماہ میں اتنے اخراجات؟''

''امی! وہ ہمارے ملک کے اعلیٰ حاکم کا محل ہے۔ ہماری جیسی کوئی چھوٹی سی کوٹھی نہیں ہے۔ وہاں کے صرف کچن کا خرچ تین ساڑھے تین لاکھ روپے ماہانہ ہے''۔

پوتا رونے لگا۔ شباہت کھانا چھوڑ کر اسے فیڈر سے دودھ پلانے لگی۔ کہنے لگی۔ ''غضب خدا کا۔ محل والے کیا چاندی کے چاول اور سونے کی روٹیاں کھاتے ہیں؟ وہ ایک دن میں دس ہزار روپے کا کھانا کیسے کھاتے ہوں گے؟''

''کھاتے کیا ہیں؟ سونگھتے ہیں۔ بڑی نزاکت سے تھوڑا کھاتے ہیں۔ باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ جتنا میز پر چھوڑتے ہیں۔ اس سے کئی گنا زیادہ کچن میں باقی بچا رہتا ہے۔ محل کی انتظامیہ اور دوسرے سامان سپلائی کرنے والے ٹھیکے دار اپنے اپنے گھروں میں وہ کھانا لے جاتے ہیں۔ ہماری کوٹھی میں بھی دوپہر اور رات کا کھانا نہیں پکتا۔ یہ مہنگے پکوان وہیں سے آتے ہیں''۔

میرے ہاتھ کا لقمہ منہ تک جاتے جاتے رک گیا۔ میں نے میز پر دور تک رکھے ہوئے انواع واقسام کے کھانوں کو دیکھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ ''اے رزاق الرحیم! تُو نے بنی اسرائیل کی بھوک پیاس دیکھ کر اس پر من وسلویٰ نازل کیا۔ شام کے پُرخار میدان میں انہیں عزت سے رزق عطا کیا۔ آہ! مجھے اور میری اولاد کو کیسا راتب دے رہا ہے؟''

راتب وہ رزق ہے، جو آقاؤں کے دستر خوان سے بچ کر خدمت گاروں کی میز پر آتا ہے۔ ان کی میز سے بچ کر نچلے درجے کے ملازموں تک پہنچتا ہے۔ پھر اس راتب کو کتوں کے سامنے پھینکا جاتا ہے۔ آقا تو یہی کہیں گے کہ ان کا بچا ہوا کتے کھاتے ہیں۔

میں نے لرزتے ہوئے اپنے پوتے کو دیکھا۔ دادی اسے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''اور یہ دودھ؟''

''ابو! محل میں خالص اور ملاوٹ سے پاک دودھ آتا ہے۔ آپ کے پوتے کو نقصان نہیں پہنچائے گا''۔

میں نے یکبارگی پوتے کے منہ سے فیڈر چھین کر پھینک دیا۔ وہ فرش پر گر کر ایک چھناکے سے ٹوٹا۔ شیشے کے ٹکڑے دور تک پھیل گئے۔ سب ہی نے چونک کر ٹوٹے ہوئے فیڈر اور پھیلے ہوئے دودھ کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ میری نظریں دونوں بیٹوں سے ملیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت ایک کتا دوسرے کتوں سے کیا بولے؟ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ راتب پتھر کی طرح آ کر میرے دماغ پر کیوں لگا تھا؟

ذرا دیر سکتے میں رہنے کے بعد سمجھ میں آیا تو میں نے پوتے کو شباہت سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کھانے کی میز سے دور ہو کر کہا۔ ''یہ زندگی گزارنے کے آداب نہیں ہیں۔ بے غیرتی سے کتے کھاتے ہیں۔ تم دونوں جو چاہو، کرو۔ جو چاہو، کھاؤ۔ اپنی آئندہ نسل کو تو راتب نہ دو۔ اٹھو شباہت، بازار سے دودھ اور فیڈر منگواؤ۔ میں اپنے پوتے پوتیوں کو اپنی کمائی کھلاؤں گا''۔

یہ کہہ کر میں نے اپنے پوتے کو چوما۔ میں دکان سے ہونے والی کمائی سے اپنے پوتے پوتیوں کو عزت کی روٹی کھلا سکتا تھا لیکن بڑی مشکل تھی۔ اقبال اور محمد علی کی لاکھوں کروڑوں کی راتب نما کمائی کی جو شان و شوکت ہے۔ اس کی چکا چوند کے سامنے معصوم بچے میرے ہاتھ سے لقمہ کھائیں گے؟ کیا پوتے کے لیے میرے ضمیر کے جاگنے سے وہ کروڑوں کی آمدنی کو ٹھکرا دیں گے؟

میں سر جھکائے پوتے کو سینے سے لگائے سوچ رہا تھا۔ پاکستان کے غریب عوام جنہوں نے پاکستان بنایا کس حال میں زندگی گزارتے بلکہ کاٹتے ہیں۔ کتنے گھر ہیں جہاں دن میں دو وقت کا فاقہ ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ سوچتا جا رہا تھا۔ میرا سر جھک رہا تھا۔ جھکتا چلا جا رہا تھا پھر میرے سینے میں جیسے ایک چبھن ہوئی کوئی چیز تھی جو سنسناتی ہوئی میرے تمام جسم میں سرایت کر گئی۔ میرا جسم لرزا۔ میں نے اپنے ماتھے پر ٹھنڈک محسوس کی میں نے گردن اٹھانی چاہی مگر میرے ارادوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نے بولنا چاہا...... چیخنا چاہا مگر اس کے بدلے جو آواز میرے ہونٹوں سے نکلی اسے سن کر سب میری طرف دوڑے۔ شباہت کا ہاتھ میرے بازو پر آیا اور گہری دھند، سرخ، سفید اور سیاہ دھند میری آنکھوں کے سامنے پھیل گئی۔

● ● ●

نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ میری آنکھ کھلی تو چاروں طرف سفیدی تھی۔ میں ہسپتال کے بیڈ پر لیٹا تھا بائیں جانب سرہانے دھری ٹی وی جیسی کسی چیز پر ایک لکیر اچھلتے کودتے ایک طرف سے دوسری طرف جا رہی تھی۔ بالکل برابر میں رکھی کرسی پر شباہت آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھی تھی اور اس کے پیچھے کھڑی ہستی کو دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کرسی کی پشت پر ہاتھ ٹکائے نورین کھڑی تھی۔ میری پلکیں کھلتے دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''مم......میں......''میں نے کچھ بولنا چاہا۔اسی وقت نورین اور شباہت کی مشترکہ آواز میرے کانوں میں آئی۔''خاموش رہئے۔ذہن پر بالکل بوجھ نہ ڈالئے''۔پھر نورین لپک کر آگے آئی اور میرے سینے پر سر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔

''مجھے کیا ہوا ہے؟''میں نے اپنی تمام ہمت مجتمع کر کے سوال پوچھ لیا۔

''کچھ نہیں......ابو......آپ بالکل ٹھیک ہیں بس ذرا دل کی گڑبڑ تھی اب سب ٹھیک ہے''۔نورین نے جواب دیا۔اسی وقت میں نے دیکھا کہ شباہت نے ایک کونے میں نماز کی نیت باندھ لی تھی۔غالباً وہ شکرانے کی نماز ادا کر رہی تھی۔

''دل میں گڑبڑ......؟''میں نے پوچھا۔

اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے دروازے کھلا اور ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔مجھے بولتے دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

''تھینکس گاڈ آپ کو ہوش آ گیا۔اس کا مطلب ہے آپ بہت تیزی سے ریکور کر لیں گے''۔پھر وہ شباہت اور نورین سے مخاطب ہوا۔''یہ سب آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ورنہ ان کی کنڈیشن بہت سیریس تھی۔بہرحال اب سب ٹھیک ہے''۔یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھ آئی نرس کو کچھ ہدایات دیں اور مجھ سے کہا۔''زیادہ باتیں آپ کے لیے نقصان دہ ہوں گی اس لیے آپ سے تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی۔بس آپ آرام کریں اور زیادہ سوال و جواب کے چکر میں نہ الجھیں۔آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ خیریت سے ہیں......''پھر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور بولا۔''آل رائٹ مسٹر علی امام!''یہ کہہ کر وہ واپس کے لیے مڑ گیا۔

اب اتنا تو میں سمجھ چکا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ بہت خطرناک رہا ہوگا مگر اب میں اپنے آپ کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔اس لیے میں نے اپنے آپ کے بارے میں کچھ پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر کے نورین سے پوچھا۔''تم کیسے آئیں۔تمہیں کس نے اطلاع دی؟''

''ابو سب کچھ بدل گیا ہے''۔اس نے جواب دیا۔''ظفر کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا اور میں ان ہی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔جب ہمیں پتا چلا کہ امی اکیلی آپ کی دیکھ بھال کر رہی ہیں......''

''ابو آپ ایک مہینے سے زیادہ بے خبر رہے ہیں۔پہلے آپ کو دل کا دورہ پڑا تھا۔جس کے بعد آپ کی کیفیت عجیب رہی نہ کچھ بولتے تھے نہ سنتے تھے۔بس خاموشی سے لیٹے رہتے تھے۔کون آیا کون گیا۔آپ کو کچھ خبر نہیں تھی۔ڈاکٹر آپ کی اس کیفیت سے بے حد پریشان تھے پھر اب دو دنوں سے آپ کچھ بہتر ہوئے تھے ایک آدھ لفظ بھی آپ کی زبان سے نکلا مگر آپ پہچان نہیں رہے۔تاہم آپ کے اس بولنے نے ڈاکٹروں کو حوصلہ دیا اور انہیں امید ہو گئی تھی کہ اب آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور دیکھ لیں آج آپ کی آنکھوں میں ہمیں شناسائی نظر آ گئی۔ابھی آپ سوتے سے اٹھے ہیں''۔وہ چپ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

''مگر اس میں میرے سوال کا جواب کہاں ہے۔وہ دونوں کہاں ہیں؟''اسی وقت مجھے اپنے پوتے کا خیال آیا اور میں بری طرح کسمسایا۔''میرا پوتا کہاں ہے؟''

''آپ کا پوتا بالکل ٹھیک ہے۔اس وقت سو رہا ہوگا''۔وہ دونوں بھائیوں کے بارے میں اب بھی کچھ نہیں بتا رہی تھی۔اسی وقت شباہت

کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ ''بیٹی بتادے انہیں وہ دونوں کہاں ہیں''۔

ماں کی بات سن کر اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا اور سر جھکا کر کہا۔ ''انہیں ظفر نے گرفتار کر کے سلاخوں کے پیچھے پہنچادیا ہے''۔

''ظفر نے......''

''جی ابو۔ جس دن آپ کو دل کا دورہ پڑا۔ اسی شام یہاں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ ایک سورج غروب ہوگیا جس کے بعد وہ صبح نمودار ہوئی جس کا سب انتظار کر رہے تھے۔ خوشیوں اور مسرتوں کی صبح مگر غلط کاروں کے لیے ان کی سیاہیوں کا حساب کتاب لیتی روشن صبح۔ اسی وجہ سے جہاں سے اس گھر میں راتب آتا تھا وہ بند ہوگیا۔ ظفر کا تبادلہ اسلام آباد ہوا اور دونوں بھائی ایئرپورٹ سے گرفتار کر کے وہاں پہنچادیئے گئے۔ جہاں انہیں بالآخر پہنچنا تھا''۔

''خدا کا شکر ہے''۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''تو اب میرے پوتے کو راتب نہیں ملے گا''۔

''جی ابو اب اسے ہی نہیں بلکہ کسی کو بھی کوئی راتب نہیں ملے گا۔ ہر کسی کو اسکا حق ملے گا۔ انصاف ملے گا۔ جیسے ظفر کو ملا''۔ اسنے تائید کی۔

''جیتی رہو بیٹی۔ مجھے بے انتہا خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹی۔ میں جیسا اپنے بیٹوں کے لیے چاہتا تھا ان کے ساتھ وہی ہوا اور وہ کام میرے داماد، میرے بیٹے نے کیا''۔ میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے ابھی امید باقی ہے۔ وہ نسل آگے آ رہی ہے۔ جو یہاں سے برائیوں کو ختم کرے گی۔ ہمیں صحیح معنوں میں آزاد کرائے گی''۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے مگر یہ آنسو بیٹوں کے لیے دکھ کے نہیں بلکہ ایک نئی صبح، نئی زندگی اور ناانصافیوں سے پاک زندگی کی خوش گوار آمد کی خوشی کے آنسو تھے۔

(ختم شد)

سلگتے چہرے

ضوباریہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول...... اُن سُلگتے چہروں کی کہانی جن پر سجی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لو دے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نرم نجل جذبوں پر فرض کا ناگ پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پرکھنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیتنے والی ہر اذیت کو اُس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ عکس کبھی پیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔